فقہ القلوب

قلبی حیات و ممات

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری

فقہ القلوب

قلبی حیات وممات

(ناروے میں ہونے والے سہ روزہ تربیتی واصلاحی کیمپ 'الہدایہ یورپ 2017ء' میں ہونے والے دروس کا مرتبہ مجموعہ)

فقہ القلوب

قلبی حیات و ممات

(ناروے میں ہونے والے سہ روزہ تربیتی و اصلاحی کیمپ ’الہدایہ یورپ 2017ء‘ میں ہونے والے دروس کا مرتبہ مجموعہ)

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری

دروس و خطبات: شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری

ترتیب و تدوین : جلیل احمد ہاشمی، محمد یوسف منہاجین
تخریج : محمد اِقبال چشتی
زیرِ اہتمام : فرید ملّت رِیسرچ اِنسٹی ٹیوٹ
[Research.com.pk]
مطبع : منہاج القرآن پرنٹرز، لاہور
اشاعت نمبر 1 : جون 2018ء [1,100-پاکستان]
قیمت : ۔۔۔۔روپے

نوٹ: شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تمام تصانیف اور ریکارڈڈ خطبات و لیکچرز کی CDs/DVDs وغیرہ سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی اُن کی طرف سے ہمیشہ کے لیے تحریکِ منہاجُ القرآن کے لیے وقف ہے۔

fmri@research.com.pk

بسم الله الرحمن الرحيم

مولاي صلّ وسلّم دائمًا أبدًا

على حبيبك خير الخلق كلّهم

محمّد سيّد الكونين والثّقلين

والفريقين من عربٍ ومن عجمٍ

اللهمّ صلّ على سيّدنا ومولانا محمّدٍ وعلى آله وصحبه وبارك وسلّم

فہرست

باب دوم

باب چہارم

باب پنجم

بابِ ششم

پیش لفظ

آج ہم فتنوں سے بھرپور زمانے میں سانس لے رہے ہیں۔ مادہ پرستی نے ایک انسان کو دوسرے انسان کا دشمن بنا دیا ہے۔ حرص و ہوس اور زر طلبی کو اِس ”اشرف المخلوقات“ نے اپنا مقصدِ زیست بنالیا ہے۔ دین گریزی نے اِس کے جسد و جاں اور عقل و خرد کو ہی نہیں بلکہ قلب و روح کو بھی مکدر کر دیا ہے۔ وہی انسان جو کبھی رشکِ ملائکہ تھا آج قصرِ ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں بھٹک رہا ہے۔ جسے مخلوق کی رشد و ہدایت کے لیے بھیجا گیا تھا آج اُسی کی رسوائی کے چرچے ہیں۔

اِن تمام خرابیوں کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انسان نے اپنے رب سے تعلق کم زور کر لیا ہے۔ اسی سبب اس کا اپنے خالق پر یقین متزلزل ہو چکا ہے۔ اس نے اپنے حقیقی پروردگار کو بھلا کر سیم و زر کو اپنا خدا بنالیا ہے۔ اللہ رب العزت پر بے یقینی اس قدر غلبہ پاچکی ہے کہ اس کی جانب سے رزق کی فراہمی اور قیامت کے روز اس کی عدالت میں حاضر ہونے کا خیال ہی دل سے محو ہو گیا ہے۔ اس نے محض نفسانی خواہشات اور شہوانی لذات ہی کو اپنا مطمعِ نظر بنا رکھا ہے۔ ترجمانِ حقیقت علامہ محمد اقبال نے انسان کی اِسی خدا گریزی اور طاغوت پرستی کو کتنے عبرت انگیز اُسلوب میں بیان کیا ہے:

بتوں سے تجھ کو اُمیدیں، خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے!

فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا
نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے!

دراصل ہم نے اپنے ایمان کی حفاظت کو اپنی ترجیحات سے خارج کر دیا ہے۔ ہمارے ہاں اخلاق نام کی کوئی عمدہ خصلت باقی نہیں رہی جو ہمارے وجود اور معاشرے کی بقا کا جواز بن سکے۔ قلوب پر پژمردگی اور یاس وناامیدی کے دبیز پردے پڑ چکے ہیں اور ایسے مردہ دلوں سے کسی حیات بخش اور فیض رسانی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ بقول حکیم الامت:

دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاری، نہ میری ضرب ہے کاری

اللہ رب العزت نے انسان کو تین اعضائے رئیسہ یعنی دل، دماغ اور جگر تفویض کیے ہیں تاکہ اس کے جسم کا نظم بہترین انداز سے چل سکے۔ پھر ان میں بھی دل کو ان سب کا سردار بنایا ہے۔ گویا دل کے پاس سارے جسم کا کمانڈ اینڈ کنٹرول ہے۔ اب یہاں سوال اٹھتا ہے کہ دل کیا ہے؟ دل جسمانی طور پر گوشت سے بنا ہوا ایک عضو ہے جو تمام جسم کو خون کی فراہمی کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ اس طرح یہ انسانی وجود کی بقا کا ضامن ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا دھڑکنا حیاتِ انسانی کی علامت ہے۔

دل کی حرکت بند ہونے سے انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے لیکن ربِ کائنات نے جس زندگی اور موت کا راز ہم پر آشکار کیا، وہ درحقیقت یہ زندگی اور موت نہیں بلکہ

وہ روحانی حیات اور ممات ہے۔ اس کا تعلق دل سے نہیں بلکہ قلب سے ہے؛ کیونکہ دل اور قلب میں فرق ہے۔ دل کا تعلق جسم سے جب کہ قلب کا تعلق روح سے ہے۔

اگر انسان کا قلب زندہ ہو تو وہ مر کر بھی زندہ ہی رہتا ہے اور اگر قلب مردہ ہو جائے تو وہ بظاہر زندہ ہو کر بھی مردہ ہوتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قلبی زندگی کیسے حاصل کی جائے ؟ اس کے بارے میں پروردگارِ جہاں اپنے لاریب کلام میں سورۃ الانفال کی آیت نمبر ۲۴ میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱسْتَجِيبُواْ لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ﴾.

اے ایمان والو! جب رسول (ﷺ) تمہیں کسی کام کے لیے بلائیں، جو تمہیں (جاودانی) زندگی عطا کرتا ہے، تو اللہ اور رسول (ﷺ) کی طرف فرماں برداری کے ساتھ جواب دیتے ہوئے حاضر ہو جایا کرو۔

غور طلب بات ہے کہ یہ کیسی زندگی ہے جو زندوں کو ہی تفویض کی جا رہی ہے۔ یہ وہی زندگی ہے جو اللہ کی بندگی اور اس کے رسول ﷺ کی پیروی میں مضمر ہے۔ معلوم ہوا کہ اللہ کے احکامات کی بجا آوری اور رسول اللہ ﷺ کی سنت مطہرہ کی اتباع ہی حیاتِ قلبی ہے۔ جسے یہ نصیب ہو گئی اُسے حقیقت میں حیاتِ جاودانی مل گئی۔

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

محترم قارئین! آپ کے ہاتھوں میں موجود کتاب حیاتِ قلبی ہی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ ۴ تا ۶ اگست ۲۰۱۷ء کو ناروے میں ہونے والے الہدایہ یورپ کیمپ کے سہ روزہ خطابات ہیں جو تحریری صورت میں مرتب کرکے آپ کے روحانی ذوق کی تشفی کے لیے پیش کیے جارہے ہیں۔

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری مدظلہ العالی نے 'فقہ القلوب' کے عنوان سے ہونے والے ان خطابات میں حیاتِ قلبی کے حوالے سے دقیق نکات پر روشنی ڈالی ہے۔ مثال کے طور پر حیاتِ قلبی سے کیا مراد ہے؟ زندہ اور مردہ دل میں کیا فرق ہے؟ حضوریِ قلب کیا ہے؟ حضوریِ قلب کیسے نصیب ہوتی ہے؟ صاحبانِ حضوریِ قلب کا مقام و مرتبہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے ساتھ ساتھ زندہ قلوب موت کا شکار کیسے ہوتے ہیں؟ پھر اُن گیارہ مراحل کا ذکر ہے کہ جو انسان کے قلب کو بتدریج مردہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ قلب کی حفاظت کے درجات اور جن لوگوں نے اپنے قلوب کی حفاظت کی، ان کے درجات اور القابات کا ذکر بھی شاملِ کتاب ہے۔ پھر یہی نہیں بلکہ مردہ قلوب کی علامات اور قلوب کو مردہ ہونے سے بچانے کی حفاظتی تدابیر بھی اس کتاب کا حصہ ہیں۔ ان موضوعات کا انتخاب اس لیے کیا گیا ہے تاکہ ان پر عمل پیرا ہو کر انسان اپنے قلوب کو ابدی موت سے بچاسکیں اور ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی کا حصول ممکن ہوسکے کیونکہ:

دلِ مردہ دل نہیں ہے، اِسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

امید ہے کہ یہ کتاب آپ کی زندگی میں خوش گوار تبدیلی لانے کا سبب بنے گی اور قلبی حیات جیسی نعمتِ عظمیٰ سے بہرہ ور ہونے کا ذریعہ بھی۔ اللہ رب العزت سے دعا

ہے کہ وہ ہمیں اپنی بندگی کی اور اپنے محبوب ﷺ کے اسوہ پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

(مرکز علم و تحقیق)

فرید ملّت رِیسرچ اِنسٹی ٹیوٹ (FMRi)

۱۷رمضان المبارک ۱۴۳۹ھ

باب اوّل

حیاتِ قلبی
اور
حضوریِ قلب

ہماری ظاہری زندگی کے جملہ معاملات کی انجام دہی اور ہمارے جسم کے جملہ اعضاء کی حرکات اس بات کی علامت ہیں کہ جسم کو زندہ رکھنے والا سب سے اہم عضو یعنی دِل حرکت کر رہا ہے، زندہ ہے اور پورے جسم کو خون پہنچا رہا ہے۔ ہمیں آکسیجن مل رہی ہے، جس سے پورے جسم کے اندر زندگی کی علامات موجود ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ زندگی تب ہی ممکن ہے جب انسان کا دل زندہ ہو اور اگر انسان کا دل ہی زندہ نہیں ہے تو پھر حقیقتاً وہ مردہ ہے۔

ا۔ حیاتِ قلبی سے کیا مراد ہے؟

اِس ظاہری حیات و ممات کے علاوہ جس حیات و ممات کے تصور کو قرآن مجید نے بیان کیا ہے وہ روحانی زندگی اور موت ہے۔ اگر انسان کا دل روحانی طور پر زندہ ہو جائے تو اِس سے مراد یہ ہے کہ اب اُسے حیاتِ قلبی نصیب ہو گئی ہے اور وہ اندھیرے سے نکل کر اجالے میں آ گیا ہے۔ اِسے زندگی کا ایک اونچا درجہ مل گیا ہے۔

قرآن مجید میں حیاتِ قلبی کا نہایت جامع تصور بیان کیا گیا ہے۔ قرآن مجید نے دل کی زندگی کو نور کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿أَوَ مَن كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَٰهُ وَجَعَلْنَا لَهُۥ نُورًا يَمْشِي بِهِۦ فِي ٱلنَّاسِ كَمَن مَّثَلُهُۥ فِي ٱلظُّلُمَٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَاۚ كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكَٰفِرِينَ مَا كَانُواْ يَعْمَلُونَ﴾[1].

بھلا وہ شخص جو مُردہ (یعنی ایمان سے محروم) تھا پھر ہم نے اسے (ہدایت کی بدولت) زندہ کیا اور ہم نے اس کے لیے (ایمان و معرفت کا) نور پیدا فرما دیا (اب) وہ اس کے ذریعے (بقیہ) لوگوں میں (بھی روشنی پھیلانے کے لیے) چلتا ہے اس شخص کی مانند ہو سکتا ہے جس کا حال یہ ہو کہ (وہ جہالت اور گمراہی کے) اندھیروں میں (اس طرح گھِرا) پڑا ہے کہ اس سے نکل ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح کافروں کے لیے ان کے وہ اعمال (ان کی نظروں میں) خوشنما دکھائے جاتے ہیں جو وہ انجام دیتے رہتے ہیںo

اس آیت میں اللہ رب العزت نے دو قسم کے لوگوں کا ذکر فرمایا ہے:

۱۔ پہلی قسم اُن لوگوں کی ہے جو مردہ دِل کے مالک تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں اس موت سے نکال کر نئی زندگی عطا کی۔

۲۔ دوسرا وہ شخص ہے جسے زندہ دِل کی صورت میں نور نصیب ہوا اور اب وہ نہ صرف اس نور کے ساتھ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے بلکہ لوگوں میں اس نور کو بانٹتا بھی ہے۔

---

(۱) الأنعام، ٦/ ١٢٢.

اس مثال سے اللہ تعالیٰ نے اندھیرے میں رہنے والے اور لوگوں میں نور بانٹنے والے کو ایک دوسرے سے یکسر مختلف قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ یہ دونوں ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ واضح رہے کہ اس آیتِ مبارکہ میں مردہ سے مراد جسمانی طور پر مردہ ہونا نہیں ہے بلکہ اِس سے مراد دل کا مردہ ہونا ہے۔ اس مردہ دل شخص کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فَأَحۡيَيۡنَٰهُ ہم نے اُسے زندگی عطا کر دی یعنی اسے حیاتِ قلبی عطا کر دی اور اُس کا دل زندہ کر دیا۔

اللہ رب العزت نے دوسرے مقام پر فرمایا ہے:

﴿مَنۡ عَمِلَ صَٰلِحٗا مِّن ذَكَرٍ أَوۡ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤۡمِنٞ فَلَنُحۡيِيَنَّهُۥ حَيَوٰةٗ طَيِّبَةٗۖ وَلَنَجۡزِيَنَّهُمۡ أَجۡرَهُم بِأَحۡسَنِ مَا كَانُواْ يَعۡمَلُونَ﴾(٢).

جو کوئی نیک عمل کرے (خواہ) مرد ہو یا عورت جب کہ وہ مؤمن ہو تو ہم اسے ضرور پاکیزہ زندگی کے ساتھ زندہ رکھیں گے، اور انہیں ضرور ان کا اجر (بھی) عطا فرمائیں گے، ان اچھے اعمال کے عوض جو وہ انجام دیتے تھےo

اس آیتِ کریمہ میں جس پاکیزہ زندگی کی بات ہو رہی ہے اِس سے مراد جسمانی زندگی (physical life) نہیں ہے۔ فَلَنُحۡيِيَنَّهُ (ہم اُسے یقیناً زندگی دے دیں گے) کا لفظ یہ واضح کر رہا ہے کہ جس زندگی کے عطا کرنے کی بات ہو رہی ہے اس سے پہلے لازمی طور پر کسی طرح کی موت ہے؛ اللہ تعالیٰ انسان کو اس موت سے نکالے گا اور

(٢) النحل، ١٦/ ٩٧.

زندہ کرے گا؛ پھر جو زندگی عطا کرے گا، اس کی تعریف میں اللہ رب العزت نے اُسے حَیَاۃً طیّبۃً کہا کہ جو زندگی دیں گے وہ بڑی مبارک، پاک، طیب اور پاکیزہ ہوگی۔

ان دونوں آیات کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اِن آیات میں انسان کے جسمانی طور پر مردہ (میت) ہونے کی بات نہیں ہو رہی بلکہ دل کی روحانی حالت کی بات ہو رہی ہے؛ کیوں کہ اگر انسان کا دل مردہ ہو جائے تو وہ بظاہر زندہ ہوتے ہوئے بھی مردہ ہوتا ہے۔ اسی طرح اِن آیات میں جس زندگی کے ملنے کی بات ہو رہی ہے اُس سے پہلے بھی انسان جسمانی طور پر زندہ ہی تھا، مگر جب روحانی طور پر اس کے دل کو نئی زندگی ملی تو اسی کو حقیقی زندگی سے تعبیر کیا گیا۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے حیاتِ قلبی کو نور اور روشنی سے تعبیر فرمایا ہے

اللہ تعالیٰ نے حیات کے ساتھ روشنی اور موت کے ساتھ اندھیرے کو جوڑا ہے۔ جس شخص کو مردہ کہا گیا، گویا وہ اللہ کی طرف سے نور اور روشنی سے محروم تھا اور جسے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ہم نے اُسے زندہ کر دیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ روشنی میں آگیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اُسے ایسی زندگی عطا فرماتا ہے کہ وہ بندہ نہ صرف خود زندہ ہوتا ہے بلکہ وہ نور لے کر لوگوں میں چلتا ہے اور وہ لوگوں میں نور تقسیم کرتا ہے جس سے دوسرے لوگ بھی منور ہوتے ہیں۔

وہ نور جو قیامت کے دِن بندہ مؤمن کے آگے پیچھے ہوگا، درحقیقت دنیا میں حیاتِ قلبی کے نصیب ہونے ہی کے سبب سے ہے۔ اس نور کا مشاہدہ ہر خاص و عام کر رہا ہوگا۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آخرت میں نور کا مشاہدہ ہو گا؟ اِس سوال کے جواب میں یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ انسان دنیا میں جو چیزیں اپنی ظاہری آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا، قیامت کے دن انہیں اپنی آنکھوں سے بالکل عیاں اور واضح طور پر دیکھ سکے گا۔ اِس بات کو سمجھنے کے لیے قرآن مجید میں مذکور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درج ذیل واقعہ پر غور کرنا ہو گا:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا:

﴿رَبِّ أَرِنِيٓ﴾(٣).

باری تعالیٰ مجھے اپنا آپ دکھا۔

موسیٰ علیہ السلام کی اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست اپنے اندر ادب واحترام اور وارفتگی کا رنگ بھی لیے ہوئے ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہ عرض نہیں کیا کہ أَنظُركَ کہ میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہاں دو چیزوں کا باہم موازنہ کرنے کی ضرورت ہے کہ جب کوئی محبوبِ حقیقی سے کہے کہ تجھے دیکھنا چاہتا ہوں تو اِس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تیرے حُسن کا احاطہ کرنا چاہتا ہوں، تیری شان کو کاملاً (completely) اور جامع (comprehensively) حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس لیے موسیٰ علیہ السلام نے یہ نہیں کہا، بلکہ عرض کیا کہ باری تعالیٰ مجھے اپنا آپ دکھا۔

---

(٣) الأعراف، ٧/ ١٤٣.

موسیٰ کے درخواست کرنے کے اس اُسلوب سے واضح ہو رہا ہے کہ وہ اس بات کا اعتراف کر رہے ہیں کہ باری تعالیٰ میں تجھے از خود نہیں دیکھ سکتا۔ یہ ایک اعلیٰ مقامِ ادب ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا:

یہ احترامِ تمنا یہ احتیاطِ جنوں
کہ تیرا ذکر کروں اور تیرا نام نہ لوں

دوسرے لفظوں میں محبوب میری یہ احتیاطِ تمنا تو دیکھ کہ میں تمنا اور خواہش بھی کر رہا ہوں مگر اُس میں احتیاط اور احترام بھی ہے حالانکہ جنون کے اندر کوئی احتیاط نہیں برتی جاتی۔ میرے جنون اور میرے عشق کو دیکھ کہ میں تیرا ذکر بھی کر رہا ہوں مگر تیرا نام بھی نہیں لے رہا۔ اگر کوئی کسی کا نام لے کر کہے کہ یہ فلاں کی بات ہے تو یہ اور اسلوب ہے اور جب کوئی محبوب کا نام بھی نہ لے اور کہے کہ یہ ''اُن'' کی بات ہے، تو اِس انداز میں ادب واحترام غالب ہے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ نہیں کہا کہ تجھے دیکھ لوں بلکہ عرض کیا: ﴿أَنظُرْ إِلَيْكَ﴾ تیری طرف دیکھ لوں۔ موسیٰ علیہ السلام کی اس درخواست پر اللہ رب العزت کی طرف سے انہیں جواب آیا:

﴿لَن تَرَىٰنِي﴾.

تو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔

معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے پیغمبر بھی دنیا میں اللہ کو نہیں دیکھ سکتے تھے جب کہ قیامت کے دن اور جنت میں ہر مؤمن اللہ تعالیٰ کی زیارت سے مستفید ہو سکے گا۔

حضرت جابر بن عبد اللہ ﷛ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

بَيْنَا أَهْلُ الْجَنَّةِ فِي نَعِيْمِهِمْ إِذْ سَطَعَ لَهُمْ نُوْرٌ فَرَفَعُوْا رُؤُوْسَهُمْ، فَإِذَا الرَّبُّ قَدْ أَشْرَفَ عَلَيْهِمْ مِنْ فَوْقِهِمْ، فَقَالَ: السَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ. قَالَ: وَذَلِكَ قَوْلُ اللهِ: ﴿سَلَٰمٞ قَوۡلٗا مِّن رَّبّٖ رَّحِيمٖ﴾ [يٰس، ٣٦/ ٥٨]، قَالَ: فَيَنْظُرُ إِلَيْهِمْ وَيَنْظُرُوْنَ إِلَيْهِ، فَلَا يَلْتَفِتُوْنَ إِلَى شَيءٍ مِنَ النَّعِيْمِ، مَا دَامُوْا يَنْظُرُوْنَ إِلَيْهِ، حَتَّى يَحْتَجِبَ عَنْهُمْ، وَيَبْقَى نُوْرُهُ وَبَرَكَتُهُ عَلَيْهِمْ فِي دِيَارِهِمْ(٤).

جنت والے اپنی نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے کہ اچانک ایک نور چمکے گا۔ وہ اپنے سروں کو اوپر اٹھائیں گے۔ تو اللہ رب العزت اوپر کی جانب ان پر جلوہ افروز ہو گا اور فرمائے گا: اے اہلِ جنت! اَلسَّلامُ عَلَيْكُمْ (تم

(٤) ١- ابن ماجه، السنن، المقدمة، باب فيما أنكرت الجهمية، ١/ ٦٥، الرقم/ ١٨٤.

٢- اللالكائي، اعتقاد أهل السنة، ٣/ ٤٨٢، الرقم/ ٨٣٦.

٣- أبو نعيم، حلية الأولياء، ٦/ ٢٠٨-٢٠٩.

٤- الديلمي، مسند الفردوس، ٢/ ١٤، الرقم/ ٢١٠٦.

٥- المنذري، الترغيب والترهيب، ٤/ ٣١٠، الرقم/ ٥٧٤٦.

٦- الهيثمي، مجمع الزوائد، ٧/ ٩٨.

پر سلامتی ہو۔) حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: کہ (قرآن مجید میں) اللہ رب العزت کے اس فرمان -(سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيمٍ○)'(تم پر) سلام ہو، (یہ) ربِّ رحیم کی طرف سے فرمایا جائے گا○'-کا یہی معنی ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: پھر اللہ رب العزت ان (اہل جنت) کی جانب نظرِ شفقت و محبت فرمائے گا اور وہ اللہ تعالیٰ (کے جلوۂ حسن) کی طرف محبت بھری نظروں سے تکنے لگیں گے۔ جب تک وہ دیدارِ الٰہی میں مشغول رہیں گے جنت کی کسی اور نعمت کی طرف متوجہ نہ ہوں گے یہاں تک کہ اللہ رب العزت ان سے پردہ فرمالے گا لیکن اس کا نور اور اس کی برکت (کا اثر) ہمیشہ ان کی رہائش گاہوں میں اور ان پر بھی قائم رہے گا۔

یہ امر ذہن نشین رہے کہ یہ عقیدہ ہمارے ایمان کا حصہ ہے کہ قیامت کے دن اور جنت میں تمام مؤمنین اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے۔ جب قیامت کے دِن اللہ تعالیٰ کو دیکھ لینا ممکن ہو گا تو مؤمن کے لیے اپنے نور کو دیکھنا بھی ممکن ہو گا۔ اسی لیے فرمایا کہ قیامت کے دن مؤمنوں کا نور اُن کے آگے پیچھے ہو گا اور وہ نہ صرف خود اس نور کو ملاحظہ کریں گے بلکہ دوسرے بھی ان کے نور کو دیکھتے ہوئے ان پر رشک کریں گے۔ یہ نور دنیا میں بھی موجود تھا مگر اسے آنکھیں دیکھ نہیں سکتی تھیں۔ دنیا میں اللہ نے آنکھوں کو یہ طاقت عطا نہیں کی گئی کہ وہ اُس نور کو دیکھ سکیں مگر قیامت کے دن یہ آنکھیں نور کو ملاحظہ کریں گی۔ اس نور کے نظر آنے کی وجہ سے ہی منافق اُن مؤمنین سے کہیں گے کہ نور کا تھوڑا سا حصہ ہمیں بھی دے دیں، کیونکہ ہم اندھیرے میں ہیں۔ نور والے کہیں گے کہ یہ نور تو ہم دنیا سے لے کر آئے ہیں، تم بھی دنیا میں واپس چلے جاؤ اور وہاں سے لے آؤ۔

ثابت ہوا کہ یہ نور مؤمنین کو جنت سے نہیں ملے گا بلکہ یہ اللہ والوں کے پاس دنیا میں موجود ہوتا تھا جو لوگوں کو دکھائی نہیں دیتا تھا مگر قیامت کے دن نہ صرف مؤمن بلکہ منافق بھی اسے دیکھ رہے ہوں گے۔ یہاں یہ بات توجہ طلب ہے کہ آخر یہ نور ہے کیا؟ حقیقت میں یہ نور وہی ہے جسے حیاتِ قلبی کہتے ہیں۔

حیاتِ قلبی کے تصور کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں واضح کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱسْتَجِيبُوا۟ لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ ۖ وَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ ٱلْمَرْءِ وَقَلْبِهِۦ وَأَنَّهُۥٓ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ﴾(٥).

اے ایمان والو! جب (بھی) رسول (ﷺ) تمہیں کسی کام کے لیے بلائیں جو تمہیں (جاودانی) زندگی عطا کرتا ہے، تو اللہ اور رسول (ﷺ، دونوں) کی طرف فرمانبرداری کے ساتھ جواب دیتے ہوئے (فوراً) حاضر ہو جایا کرو اور جان لو کہ اللہ، آدمی اور اس کے قلب کے درمیان (شانِ قربتِ خاصہ کے ساتھ) حائل ہوتا ہے اور یہ کہ تم سب (بالآخر) اسی کی طرف جمع کیے جاؤ گے ○

اس آیتِ کریمہ میں ایمان والوں سے فرمایا جا رہا ہے کہ جب تمہیں اللہ اور اس کا رسول ﷺ بلائیں تو جس حال میں بھی ہو اور جو کچھ بھی کر رہے ہو حتیٰ کہ نماز پڑھ رہے ہو

---

(٥) الأنفال، ٨/ ٢٤.

تو بھی آقا ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو جایا کرو۔ اس لیے کہ لِمَا یُحۡیِیۡکُمۡ کا مطلب ہے کہ رسول ﷺ تمہیں زندگی عطا فرماتے ہیں۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب آپ ﷺ اپنے اردگرد موجود زندہ صحابہ کرام ہی میں سے کسی کو بلا رہے ہیں، تو پھر انہیں کون سی زندگی عطا کرنے کے لیے بلا رہے ہیں؟ معلوم ہوا کہ اِس جسمانی زندگی کے علاوہ بھی ایک زندگی اور ہے جس کی انہیں ضرورت ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ جب اللہ کے رسول تمہیں بلاتے ہیں تو فوراً اُن کی خدمت میں حاضر ہو جاؤ کیونکہ وہ تمہیں جس طرف بھی بلائیں گے، اُس سے تمہیں حیات ہی ملے گی۔

اِن آیات سے ثابت ہوا کہ بعض اوقات انسان جسمانی طور پر زندہ ہونے کے باوجود روحانی طور پر مردہ ہوتا ہے، اس لیے کہ اُس کا دل مردہ ہوتا ہے۔ اصل زندگی تو روحانی زندگی ہے۔ اگر انسان روحانی طور پر مردہ ہے، تو اِس کا مطلب ہے کہ انسان کا دل مردہ ہے۔ بقول اقبالؔ:

دلِ مردہ دل نہیں ہے، اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کُہن کا چارہ

گویا قرآن مجید سے یہ ثابت ہو گیا کہ کئی لوگ زندہ ہو کر بھی مردہ ہی ہوتے ہیں اور کچھ وفات پا کر بھی زندہ رہتے ہیں۔ مر کر زندہ رہنے والوں کی جسمانی موت سے ان کی روحانی زندگی پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یوں بندۂ مؤمن یا ولی اللہ جب زمین پر چل پھر رہا ہو یا قبر میں لیٹا ہو، وہ ہر حال میں زندہ ہی ہے، اس لیے کہ اصل زندگی روحانی

زندگی ہے جو اُسے جسمانی زندگی کے ساتھ بھی حاصل ہے اور جسمانی زندگی کے بغیر بھی۔

(۲) حقیقتِ معرفت اور اس کا راز

قلبی حیات و ممات کا یہ تصور عرفاء کے اس قول سے بھی سمجھ میں آسکتا ہے:

مَنْ مَاتَتْ نَفْسُهُ بَعُدَتْ عَنْهُ دُنْيَاهُ، وَمَنْ مَاتَ قَلْبُهُ بَعُدَ عَنْهُ مَوْلَاهُ(٦).

جس کا جسم مر جائے، دُنیا اس سے دُور ہو جاتی ہے؛ اور جس کا دل مر جائے، مولا اُس سے دُور ہو جاتا ہے۔

مرنے کے بعد انسان کو قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ اس کے تمام پس ماندگان اس سے دور ہو جاتے ہیں۔ گویا ساری دنیا ہی اس سے دور ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس جس کا دل مر جائے، تو مولا اُس سے دُور ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اگر دل زندہ ہو تو اللہ رب العزت اس حیاتِ قلبی کے حامل انسان کے قریب ہوتا ہے اور دل کی اسی حیاتِ نو کو معرفت کہتے ہیں۔

یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ دل زندہ کیسے ہوتا ہے؟ دل اس وقت زندہ ہوتا ہے جب وہ زندہ کرنے والے کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔ زندہ کرنے والے کو 'مُحْيِي' کہتے ہیں اور وہ اللہ رب العزت کی ذات ہے۔ جو کوئی اُس کے ساتھ جڑ جائے وہ بھی زندہ ہو جاتا

(٦) أحمد الرفاعي، حالة أهل الحقيقة مع الله/ ٧.

ہے۔ اسی لیے قلبی حیات کا راز اللہ کے ساتھ تعلق میں پوشیدہ ہے۔ جو اُس سے جڑ جاتے ہیں وہ زندہ ہو جاتے ہیں اور جو اُس سے کٹ جاتے ہیں زندہ ہو کر بھی وہ مردہ۔

اس بات کو ہم اس مثال کے ذریعے بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ ایک آدمی بالکل قریب المرگ ہے تو اسے آکسیجن پر لگا دیتے ہیں اور اس طرح اُسے مصنوعی زندگی (artificial life) کے طور پر چلاتے ہیں۔ مشین اس کے دل کو بھی چلا رہی ہے اور اس کے دماغ، پھیپھڑے اور دیگر اعضاء کو بھی۔ دس، پندرہ دن یا مہینہ اسی طرح چلائے رکھنے کے باوجود بھی مریض اگر شفایاب نہیں ہوتا تو ڈاکٹر مریض کے لواحقین سے مشین لگائے رکھنے یا ہٹانے کے بارے میں رائے لیتے ہیں۔ بعض اوقات تو ڈاکٹر یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ اس شخص کی طبعی موت واقع ہو چکی ہے مگر مشینوں کے ذریعے اس کی عارضی زندگی قائم ہے۔ جب تک وہ مریض مشینوں کے ساتھ جڑ کر زندہ رہتا ہے۔ جب مشین ہٹ جاتی ہے تو اس کی موت بھی واقع ہو جاتی ہے۔

بالکل اسی طرح بندے کو روحانی طور پر زندہ رکھنے والی اللہ تعالیٰ کی ہی ذات ہے۔ اگر بندہ اللہ کے ساتھ جڑ جائے تو اس کا دل بھی زندہ ہو جاتا ہے۔ جس طرح مشین ہٹانے سے موت واقع ہو جاتی ہے عین اسی طرح جو دل اللہ کی یاد سے ہٹ گیا دھڑکنے کے باوجود بھی وہ مردہ ہو جاتا ہے۔ ہمارے دل کی زندگی و موت کا راز یہی ہے کہ دل اگر اللہ سے جڑا رہا تو زندہ رہا اور اگر اللہ سے کٹ گیا تو مردہ ہو گیا۔

حقیقتِ معرفت یہی ہے کہ اللہ رب العزت کے ساتھ جڑنے سے دل کو حیاتِ نو ملتی ہے اور زندگی کے مل جانے سے معرفت نصیب ہوتی ہے اور جو اس طرح زندہ ہو جاتا ہے پھر اسے نظر بھی آتا ہے، وہ دیکھتا بھی ہے، بولتا بھی ہے، سنتا بھی ہے اور

محسوس بھی کرتا ہے۔ اس کے برعکس مردہ نہ تو دیکھتا ہے، نہ ہی سنتا ہے اور نہ ہی محسوس کر سکتا ہے۔

اسی حوالے سے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ ءَاذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَآ ۚ أُوْلَٰٓئِكَ كَٱلْأَنْعَٰمِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْغَٰفِلُونَ﴾(٧).

وہ دل (و دماغ) رکھتے ہیں (مگر) وہ ان سے (حق کو) سمجھ نہیں سکتے اور وہ آنکھیں رکھتے ہیں (مگر) وہ ان سے (حق کو) دیکھ نہیں سکتے اور وہ کان (بھی) رکھتے ہیں (مگر) وہ ان سے (حق کو) سن نہیں سکتے، وہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ (ان سے بھی) زیادہ گمراہ، وہی لوگ ہی غافل ہیں۔

(۳) زندہ اور مردہ دل میں فرق

حیاتِ قلبی نصیب ہو جانے کے بعد جب بندہ عارف ہو جاتا ہے، تو اسے وہ سب کچھ دکھائی دیتا ہے، جسے مردہ دل نہیں دیکھ پاتا۔ وہ اُن باتوں کو بھی سنتا ہے جنہیں مردہ دل نہیں سن سکتے، وہ اُن چیزوں کو بھی محسوس کرتا ہے جنہیں مردہ دل محسوس نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات عارف وہ باتیں بھی کر دیتا ہے جو لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتیں کیونکہ جو وہ جانتا، سنتا اور دیکھتا ہے، وہ نہ تو لوگوں کو سنائی دے رہی ہیں اور نہ ہی

---

(٧) الأعراف، ٧/ ١٧٩.

دکھائی۔ اس لیے کہ وہ زندہ نہیں ہیں، ان کے دل مردہ ہو چکے ہیں۔ اس میں اور زندہ دل میں فرق ہے۔ واضح رہے کہ مردہ دِل ہمیشہ عارف کی بات کو سمجھنے سے محروم رہتے ہیں۔

فرض کریں کہ اگر اللہ رب العزت مُردے کو بولنے کی طاقت عطا کر دے اور اس کے ساتھ ایک زندہ شخص بھی بیٹھا ہو تو پھر اُن دونوں کے درمیان یہ مکالمہ ہو:

- زندہ: واہ! کتنا خوبصورت منظر ہے۔
  مردہ: کون سا منظر؟ مجھے تو کچھ بھی نظر نہیں آرہا۔
- زندہ: تم تو مردہ ہو، تمہارے پاس آنکھ ہی نہیں ہے تو نظر کیسے آئے گا؟ واہ! کیا خوبصورت آواز ہے۔ کیا خوبصورت نغمہ ہے۔
  مردہ: کون سا نغمہ؟ مجھے تو کچھ سنائی نہیں دے رہا۔
- زندہ: تم تو مردہ ہو، تمہارے پاس کان ہی نہیں ہیں تو تمہیں سنائی کہاں سے دے؟
- زندہ: واہ! خوبصورت پھولوں کی کیا خوشبو آرہی ہے۔
  مردہ: کون سی خوشبو؟ مجھے تو کچھ محسوس نہیں ہو رہا۔
- زندہ: تم تو مردہ ہو، سونگھ ہی نہیں سکتے تو خوشبو بھلا کہاں سے آئے؟

الغرض جب مردے میں حواس ہی نہیں ہیں، تو وہ بے چارہ کیا دیکھے، سنے، بولے اور محسوس کرے گا؟ یہی کیفیت ایک عارف کی ہوتی ہے کہ جب وہ مُردوں یعنی حیاتِ قلبی سے محروم لوگوں میں چلتا پھرتا ہے تو اُن مُردوں کو تو کچھ نظر نہیں آتا، مگر اُس عارف کو سب کچھ نظر آرہا ہوتا ہے۔ مُردوں کو سنائی نہیں دیتا، مگر اُسے سنائی دیتا

ہے۔ مُردوں کو کچھ سمجھ نہیں آتا مگر اسے سب کچھ سمجھ آرہا ہوتا ہے۔ جب کوئی دل کا مردہ ہو جاتا ہے تو عارف کی باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آتیں۔

(۴)مریض قلب کی کیفیت

زندہ دل اور مردہ دل کے درمیان بھی ایک درجہ ہے اور وہ ہے مریض دل کا درجہ۔ مریض کا شمار تو زندوں میں ہوتا ہے مگر اس کے کچھ حالات زندہ جیسے اور کچھ حالات مردہ جیسے ہوتے ہیں۔ دل کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ کچھ دل مردہ ہوتے ہیں یعنی نور سے مکمل طور پر محروم، جیسے: کفار و مشرکین اور بہت زیادہ فسق و فجور، گناہ، اللہ تعالیٰ سے دوری اور دنیا پرستی میں مبتلا لوگوں کے دل مردہ ہوتے ہیں۔ کچھ دل زندہ ہوتے ہیں اور جو دل زندہ ہوتے ہیں، وہ غافل نہیں ہوتے بلکہ بظاہر سوئے ہوئے بھی جاگ رہے ہوتے ہیں۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو جاگتے ہوئے بھی سوئے ہوتے ہیں۔

اس ضمن میں سلطان العارفین حضرت سلطان باھوؒ نے کیا خوب فرمایا ہے:

کئی جاگن کئی جاگ نہ جانن، کئی جاگدیاں وی سُتّے ھُو
کئیاں نُوں ربّ سُتیاں ملیا، کئی جاگدے وی گئے مُٹھے ھُو

مریض دل کا درجہ زندہ اور مردہ دل کے درمیان ہے۔ جس طرح جسم مریض ہو جاتے ہیں اِسی طرح دل بھی مریض ہو جاتے ہیں۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

أَلَا! وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً، إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا! وَهِيَ الْقَلْبُ(٨).

آگاہ ہو جاؤ! بے شک جسم میں ایک لو تھڑا ہے، اگر وہ صحیح ہو جائے تو سارا جسم صحیح ہو جاتا ہے؛ لیکن اگر وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ آگاہ ہو جاؤ! وہ دل ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے اِس حدیث میں اس بات پر توجہ دلائی کہ اے لوگو! اِس جسم میں دِل کے نام سے گوشت کا ایک ایسا ٹکڑا ہے، جو پورے جسم کو چلاتا ہے اور پورے جسم کا دارو مدار اُسی پر ہے۔ جس کا دل ٹھیک ہو جائے؛ نیک و صالح ہو جائے؛ تقویٰ پر قائم رہنے والا اور اللہ کے نور سے زندہ ہو جانے والا ہو جائے تو پورا جسم درست و صحیح ہو جاتا ہے۔ یعنی پورا جسم دِل کا مطیع ہو جاتا ہے۔ ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان اور جسم کے دوسرے اعضا بھی صالح اور نیک ہو جاتے ہیں۔ اس دِل سے مراد خون کو پمپ کرنے والا دِل نہیں ہے بلکہ وہ اور دل ہے۔ یہاں جس دل کی بات ہو رہی ہے، یہ سینے کے اندر ایک دل ہے، جو روح کا مرکز ہوتا ہے، جہاں روح جنم لیتی ہے۔ اگر یہ دل ٹھیک ہو جائے تو سارا جسم سنور جاتا ہے، اطاعت گزار اور نیک و صالح ہو جاتا ہے۔

---

(٨) ١- البخاري، الصحيح، كتاب الإيمان، باب فضل من استبرأ لدينه، ١/ ٢٨، الرقم/ ٥٢.

٢- مسلم، الصحيح، كتاب المساقاة، باب أخذ الحلال وترك الشبهات، ٣/ ١٢١٩، الرقم/ ١٥٩٩.

اس کے برعکس اگر یہ دل خراب ہو جائے تو آپ ﷺ کے فرمان وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الجَسَدُ كُلُّهُ کے مصداق انسان کا پورا جسم خراب ہو جاتا ہے۔ یعنی جسم بھی گناہ، نافرمانی اور معاصی کی زد میں آجاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ انسان کے پورے جسم کو نیک اور بد کرنے والا اور پوری زندگی کو نیکی پر چلانے اور بدی پر لگانے والا عضو، قلب ہے۔ یہ بات تو روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ زندگی کے سارے حالات دل کے ذریعے سے ہی متعین ہوتے ہیں۔ دل پورے جسم کو نیک بھی کر سکتا ہے اور بد بھی۔ پوری زندگی کو نیکی پر چلانے یا گناہ اور بدی پر لگانے کا سارا کنٹرول دل کے پاس ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

لَا يَسْتَقِيْمُ إِيْمَانُ عَبْدٍ حَتَّى يَسْتَقِيْمَ قَلْبُهُ.(٩)

کسی شخص کا ایمان اُس وقت تک استقامت حاصل نہیں کر سکتا جب تک اُس کا دل مستقیم نہ ہو جائے۔

دوسرے لفظوں میں کوئی شخص اُس وقت تک سیدھے راستے پر نہیں چل سکتا، جب تک اُس کا دل سیدھے راستے پر نہ آجائے۔ اس لیے کہ انسان کے سارے معاملات دل سے شروع ہوتے ہیں۔ اگر دل میں نیکی، اچھائی اور بھلائی آجائے تو نیکی اور بھلائی کے سارے راستے کھل جاتے ہیں اور اگر دل میں بدی، بُرائی اور کجی آجائے تو بدی اور بُرائی کے تمام راستے کھل جاتے ہیں۔ انسان کے دل میں اندھیرا آجائے تو ساری زندگی مردہ ہو

---

(٩) ١- أحمد بن حنبل، المسند، ٣/ ١٩٨، الرقم/ ١٣٠٧١.
٢- الطبرانی، المعجم الکبیر، ١٠/ ٢٢٧، الرقم/ ١٠٥٥٣.

جاتی ہے اور اگر انسان کے دل میں نور آجائے تو انسان کی پوری زندگی کو نور نصیب ہو جاتا ہے۔

۲۔ حضوریِ قلب کیا ہے؟

حیاتِ قلبی کی اہمیت و افادیت ہی کے پیشِ نظر اللہ کے انبیاء و رُسل، اولیاء، عرفاء اور جس قدر بھی مردانِ حق دنیا میں تشریف لائے اُن سب نے اصلاح کا عمل، دل کی پاکیزگی اور طہارت سے شروع کیا کیونکہ اِس سے خیر کا چشمہ پھوٹتا ہے۔ خیر کا چشمہ دِل سے کس طرح پھوٹتا ہے؟ یہ بات دلچسپ ہے کہ ہم نے یہ تو جان لیا کہ دل اللہ کے ساتھ جڑنے سے زندہ ہو گیا، یعنی اُس میں اللہ کا نور آ گیا۔

آیئے! اب اس امر کا جائزہ لیتے ہیں کہ دِل سے خیر کا چشمہ کیسے پھوٹتا ہے، دِل کی حضوری کیا ہے اور یہ بندے کو کیسے نصیب ہوتی ہے؟

اس حوالے سے ہمارے ذہنوں میں کئی سوالات ابھرتے ہیں کہ ہم نماز، عبادت، تلاوت، ذکر اَذکار اور دعا میں اللہ کو پکارتے ہیں، مناجات کرتے ہیں اور اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں، مگر اِس کے باوجود دل حاضر نہیں ہوتا۔

آیئے! دل کی حضوری کو ایک مثال سے سمجھتے ہیں:

ہم نے کئی بار مشاہدہ کیا ہو گا کہ کچھ لوگوں میں قوتِ ارتکاز (concentration) نہیں ہوتی، وہ بات سنتے ہیں مگر کچھ سمجھ نہیں پاتے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ یہ حاضر دماغ نہیں ہیں، ان کی اس بات کی طرف توجہ نہیں ہے۔

اسی طرح کئی طلبہ میں ارتکاز (concentration) کی کمی ہوتی ہے۔ وہ گھنٹوں کتاب لیے بیٹھے رہتے ہیں، مگر کہتے ہیں کہ ہمیں کچھ یاد نہیں ہوتا۔

یاد رکھیں! ہر ایک کو حافظے (memory) کا مسئلہ نہیں ہوتا بلکہ بہت سے لوگوں کو ارتکاز (concentration) کا مسئلہ بھی ہوتا ہے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے الفاظ، سطور اور صفحات گزرتے رہتے ہیں مگر توجہ کسی اور جانب ہونے کی وجہ سے انہیں کچھ بھی یاد نہیں ہو پاتا۔

اسی طرح بعض اوقات جب ہم کسی کی گفتگو سن رہے ہوتے ہیں لیکن کسی پریشانی کی وجہ سے ہماری توجہ کلی طور پر اس کی بات کی طرف نہیں ہوتی۔ بعض اوقات چاق و چوبند نہ ہونے (lack of alertness) کی وجہ سے کسی چیز کو دیکھ کر بھی غلط پڑھ جاتے ہیں۔ لفظ کچھ اور لکھا ہوتا ہے مگر ہم کچھ اور سمجھ کر پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر سے پوچھیں کہ یہ کیا مسئلہ ہے؟ تو وہ کہتا ہے کہ یہ lack of alertness ہے۔ دراصل اس کے کئی اسباب اور کئی علامات ہوتی ہیں؛ ان میں سے ایک علامت یہ ہے کہ اگر دماغ حاضر (alert) نہ ہو تو ہمارے سامنے لکھا ہوا کچھ اور ہوتا ہے لیکن ہم غلط پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ اگر ارتکاز نہیں ہو گا تو جو ہم پڑھ رہے ہیں وہ ہمیں کبھی سمجھ نہیں آئے گا۔ ذہنی پریشانیوں اور تفکرات کی وجہ سے بعض اوقات یہ مسئلہ عارضی ہوتا ہے اور بعض اوقات دائمی۔

(۱) حضوریِ قلب کے درجات

جس طرح دنیاوی معاملات میں بہت سے لوگوں کا دماغ حاضر نہیں ہوتا، بالکل اسی طرح عبادات میں بھی کچھ لوگوں کا دل حاضر نہیں ہوتا۔ وجود اور جسم حاضر ہوتا ہے

مگر دل غائب ہوتا ہے۔ بندہ عبادت، ذکر اَذکار، تلاوت اور مناجات کر رہا ہوتا ہے مگر اسے حضوریِ قلب نصیب نہیں ہوتی۔ اس صورتِ حال میں وہ بڑی کوشش کرتا ہے کہ حضوریِ قلب نصیب ہو جائے مگر ایسا نہیں ہوتا۔ بندہ مجبور ہو کر کہہ اُٹھتا ہے کہ اب کیا کروں؟

یادرکھیں! حضوریِ قلب کے مندرجہ ذیل دو درجات ہیں:

۱۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ بندہ جو عبادت، اطاعت، تلاوت، ذکر، اللہ کی یاد اور مناجات کر رہا ہے؛ اُس میں بندے کا دل حاضر ہو۔ دل کا حاضر ہونا یہ ہے کہ ہم ذکر، عبادات، اطاعت، تلاوت اور نیک کام دل جمعی کے ساتھ کر رہے ہیں۔ دل کی یہ حاضری بہت سارے لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ یہ حضوریِ قلب کا ایک ادنیٰ درجہ ہے۔ ہر شخص جو حاضر دماغ ہوتا ہے، ضروری نہیں کہ وہ حاضرِ قلب بھی ہو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جس کا دل حاضر ہو وہ صاحبِ حضوریِ قلب بھی ہو۔ دل کا حاضر ہونا اور چیز ہے اور صاحبِ حضوریِ قلب ہونا اور چیز۔

۲۔ حضوریِ قلب کا دوسرا درجہ پہلے درجے سے بڑھ کر ہے اور وہ اس طرح کہ کچھ لوگوں کے دل کا حاضر ہونا اِس ذکر کے ساتھ نہیں ہوتا بلکہ مذکور کے ساتھ ہوتا ہے یعنی دل اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہو جائے تو اُسے حضوری کہتے ہیں۔ پہلے درجے کا حامل دِل، ذکر کے ساتھ حاضر ہوتا ہے اور جو دل اللہ کے ساتھ جڑ جاتا ہے، اسے حضوری حاصل ہوتی ہے۔ حضوری کا مطلب یہ ہے کہ اسے اللہ رب العزت تک رسائی مل چکی ہے۔ اب یہ بعد کی بات ہے کہ اُس کے اندر ان فیوضات و تجلیات کو حاصل کرنے کی کتنی صلاحیت (capacity) ہے اور وہ کیا کچھ حاصل کرتا ہے اور کیا کچھ حاصل نہیں کر پاتا۔

گویا پہلا درجہ غیر حاضر تھا جب کہ اب حاضر ہو گیا ہے اور حاضر ہو جانے کے بعد کتنا سمجھ پاتا ہے اور کتنی رسائی حاصل کرتا ہے؟ یہ اُس کا اپنا نصیب ہے۔ پس صاحبِ حضوریِ قلب وہ ہو گا جسے ذات باری تعالیٰ تک رسائی کیوں نصیب نہیں ہوتی۔

(۲) حضوریِ قلب کیسے نصیب ہوتی ہے؟

اولیاء و صالحین اور عُرفاء سے کسی نے سوال کیا کہ دل کو حضوری کیوں نصیب نہیں ہوتی؟ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دل کو غائب پاتا ہوں، میرا دل اللہ کی بارگاہ میں کیسے حاضر ہو گا؟

انہوں نے جواب دیا:

اِذَا نَزَلَ فِيْهِ الْحَقُّ.

جب تمہارے دل میں اللہ ٹھکانہ کر لے گا۔

پوچھا: اللہ میرے دل میں کب ٹھکانہ کرے گا؟

جواب ملا:

اِذَا ارْتَحَلَ عَنْهُ مَا دُوْنَ الْحَقِّ(۱۰).

جب حق تعالیٰ کا غیر اس کے دل سے کوچ کر جائے۔

---

(۱۰) أحمد الرفاعي، حالة أهل الحقيقة مع الله/ ۱۱٦.

واضح رہے کہ غیروں کے ہوتے ہوئے وہ دل میں نہیں آئے گا۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غیر کون ہیں؟ یاد رکھیں! ہر وہ چیز جو اللہ کو پسند نہیں ہے، وہ اُس کا غیر ہے۔ اگر دل میں اُس کے غیر کی شہوت ورغبت بھی ہو اور ہم چاہیں کہ اس میں اللہ بھی آ جائے، تو اللہ کی غیرت اسے ہرگز گوارا نہیں کرتی۔ وہ کہتا ہے کہ تم نے دل میں جسے سجایا ہوا ہے، اسی سے دل لگاؤ۔ اس کے برعکس جب دل سے اُس کے غیر نکل جاتے ہیں تو بندہ خود بخود پکار اُٹھتا ہے۔ خواجہ عزیز الحسن مجذوب کیا خوب منظر کشی کرتے ہیں:

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آ جا، اب تو خلوت ہو گئی

اللہ رب العزت کا قاعدہ یہ ہے کہ جب دل سے اُس کے غیر نکل جاتے ہیں اور دل نہاں خانہ اور خلوت کدہ بن جاتا ہے تو وہ اس میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اُس کے جلوہ گر ہونے سے دل زندہ ہو جاتا ہے اور جب دل مکمل طور پر زندہ ہو گیا، تو وہ اللہ کے حضور رہنے لگ جاتا ہے اور اس تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ صاحبانِ حضوریِ قلب کا مقام یہ ہوتا ہے کہ اِن کے جسم فرش پر ہوتے ہیں، مگر ان کے دل عرش پر پہنچ جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے دل خلوت کدہ بن جاتے ہیں جن میں اللہ رب العزت جلوہ گر ہوتا ہے اور جس جگہ اللہ جلوہ گر ہو جائے وہی جگہ سراپائے عرش ہو جاتی ہے۔

(۳)صاحبانِ حضوریِ قلب کا مقام

جب دل حضوریِ قلب کی بناء پر زندگی پا جاتے ہیں تو ان پر انوارِ الٰہیہ کا نزول ہوتا ہے۔ اس طرح یہ دل نفسِ انسانی کی ہدایت کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ ایسے شخص کو قرآنِ مجید کی آیاتِ مبارکہ سے نصیحت اور تذکیر نصیب ہوتی ہے۔

اسی بارے میں اللہ رب العزت فرماتا ہے:

﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُۥ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى ٱلسَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ﴾(١١).

بے شک اس میں یقیناً انتباہ اور تذکّر ہے، اس شخص کے لیے جو صاحبِ دل ہے (یعنی غفلت سے دوری اور قلبی بیداری رکھتا ہے) یا کان لگا کر سُنتا ہے (یعنی توجہ کو یک سُو اور غیر سے منقطع رکھتا ہے) اور وہ (باطنی) مشاہدے میں ہے (یعنی حسن و جمالِ الوہیت کی تجلّیات میں گم رہتا ہے)۔

اس آیتِ مبارکہ نے واضح کر دیا کہ نصیحت اور فائدہ اس کے لیے ہے لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ جس کے پاس قلبِ بیدار، یکسوئی، غیر سے انقطاع اور دولتِ مشاہدہ موجود ہے۔

مذکورہ بالا تمام تر علمی بحث کا لبِ لباب یہ ہے کہ صاحبِ حضوریِ قلب وہی ہے جو صاحبِ معرفت ہے کیونکہ معرفت دل کی زندگی ہی کا نام ہے۔ جس کا دل زندہ ہو

---

(١١) ق، ٥٠/ ٣٧.

جائے اسے معرفت نصیب ہو جاتی ہے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ دل اللہ رب العزت کے ساتھ جڑنے سے زندہ ہوتا ہے اور بندہ اپنے رب کے ساتھ اس وقت تک دل نہیں جوڑ سکتا جب تک اللہ کے غیر کا گمان بھی دل سے نہ نکل جائے۔ دوسرے لفظوں میں وہ چیزیں جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند اور اس کی بارگاہ سے دور لے جانے والی ہیں، اگر دل میں رہیں گی، تو اللہ رب العزت کبھی اُس دل میں نہیں آئے گا۔ اولاً اُن سے اِنخلاء ہو تو تب ہی اللہ رب العزت اس دل میں اترتا ہے اور اپنا نور اس دل میں ڈالتا ہے، پھر بندے کے دل کا تعلق اللہ سے قائم ہوتا ہے اور یہ تعلق و اتصال بندے کے دل کو زندہ کر دیتا ہے۔

باب دوم

زندہ قلوب
موت کا شکار کیسے ہوتے ہیں؟

قلوب کا موت کا شکار ہو جانا ایک ایسا معاملہ ہے جس میں انسان کے اپنے اعمال کا سو فیصد کردار ہوتا ہے۔ ہمارے اعمال ہمارے قلوب پر کیسے اثر انداز ہوتے ہیں اور پھر ہمارے قلوب موت کا شکار کیسے ہوتے ہیں؟ زیرِ نظر صفحات پر انہی امور کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

۱۔ قلبی حیات و ممات میں اَعمال کی اَہمیت

واضح رہے کہ نیک اعمال ہی دلوں کو حیاتِ جاوداں کی طرف لے کر جاتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نیکیاں، اطاعت وعبادت، حسنِ اَخلاق، حسنِ معاملات، صدقات وخیرات، تلاوتِ قرآن، ذکرِ الٰہی، توبہ واِستغفار، خدمتِ خلق، فضل واِحسان، یتیموں کی پرورش، علمِ نافع کا حصول اور اس کی تعلیم دینا، دین کی خدمت کرنا، انسانیت کی خدمت کرنا، بڑوں کی عزت و تکریم کرنا، دوسروں پر احسان و بھلائی کرنا، الغرض جتنے بھی نیک اعمال ہیں؛ خواہ عبادات کی شکل میں ہیں یا معاملات کی شکل میں، خواہ اخلاق اور آداب کی شکل میں ہیں یا ان کی حیثیت مذہبی یا غیر مذہبی (secular) ہے۔ اگر یہ تمام اَعمال اللہ رب العزت اور اس کے رسول ﷺ کے حکم اور ان کے امر کی تعمیل کی نیت سے سرانجام دیے جائیں تو یہ اللہ رب العزت کی رضا کا سبب اور اس کی قربت کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ ان اعمالِ صالحہ کی بجا آوری قلوب کو زندگی بخشتی اور جِلا عطا کرتی ہے۔

اس کے بر عکس اعمالِ بد، اعمالِ سیئہ، معصیت کاری، اللہ کی نافرمانی، ظلم، غفلت، دوسروں پر زیادتی، جہالت کے افعال، غصہ، جبر، حسد، غیبت، چغل خوری، ناانصافی، حق تلفی اور دیگر جتنے بھی گناہ کے کام ہیں، خواہ ان کی حیثیت مذہبی (religious) ہو یا غیر مذہبی (secular)، اللہ کی ناراضی کا سبب بنتے ہیں اور قلوب کو مردہ کرنے کا باعث بھی بنتے ہیں۔

۲۔ معاملۃ القلوب

کوئی بھی عمل خواہ وہ نیکی کا ہو یا بدی کا، فرماں برداری کا ہو یا نافرمانی کا؛ اچانک وجود میں نہیں آ جاتا بلکہ اس کے پیچھے کئی مراحل موجود ہوتے ہیں۔ یہ پس منظر اور مراحل ہمیں بظاہر نظر نہیں آرہے ہوتے، نظر صرف سرانجام دیا جانے والا فعل ہی آرہا ہوتا ہے۔ یعنی جس فعل کے بارے میں ہم سوچ رہے ہیں یا جس کے کرنے کی خواہش رکھتے ہیں یا جس کی انجام دہی کا ارادہ کر لیا ہے تو وہ اُس وقت تک نظر نہیں آتا جب تک ہم اسے کر نہ گزریں۔ جب وہ ایک فعل (act) بنتا ہے اور ہم اسے کرتے یا بولتے ہیں، تو وہ فعل دکھائی یا سنائی دیتا ہے۔ تب جا کر پتہ چلتا ہے کہ فلاں شخص نے کوئی فعل کیا ہے۔ گویا جب وہ فعل کیا تب نظر آ گیا۔ اس فعل کے نظر آنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ فعل وجود میں بھی ابھی آیا ہے جب ہم نے اسے کیا، نہیں، بلکہ اُس کے پیچھے ایک کہانی تھی جس کے کئی مرحلے تھے اُور اِن مراحل سے گزر کر ایک خیال عمل کی صورت اختیار کرتا ہے اور عملی صورت اختیار کرنے سے پہلے وہ فعل مرحلہ وار خیال کی مختلف صورتوں میں دل میں ہی رہتا ہے۔ واضح رہے کہ اس سارے عمل کو معاملۃ القلوب کہتے ہیں۔

معاملۃ القلوب یہ ہے کہ چیزیں دل پر مثبت طور پر اور منفی طور پر کیسے اثر انداز ہوتی ہیں؟ دل کس طرح بیمار ہوتا ہے؟ کس طرح تدریجاً اس کی روحانی موت واقع ہو جاتی ہے؟ اسی طرح دل کو صحبتِ صالحہ کے توسط سے کیسے صحت میسر آتی ہے کہ وہ رفتہ رفتہ مکمل صحت منداور زندہ ہو جاتا ہے؟

دلوں کی موت وحیات میں عمل کی اثر پذیری کو سمجھنے کے بعد، اب ہم یہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ زندہ دل موت کا شکار کیسے ہوتے ہیں؟

۳۔ قلب مردہ ہونے کے مراحل

کسی بھی خیال کے عمل کی شکل اختیار کرنے سے قبل دل میں کئی قسم کے معاملات پیش آتے ہیں۔ دل یک دم موت کا شکار نہیں ہوتے بلکہ حیاتِ قلبی کی تنزّلی کا یہ سفر بتدریج طے ہوتا ہے۔ اللہ رب العزت کی نافرمانی، گناہ اور معصیت کا فعل یک دم معرضِ وجود میں نہیں آتا بلکہ اِس کے پیچھے ایک مکمل کہانی ہوتی ہے جو انسان کو درجہ بدرجہ، اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری سے نکال کر معصیت و نافرمانی تک لے جاتی ہے۔ ہدایت سے گمراہی، فرماں برداری سے نافرمانی اور زندہ دلی سے مردہ دلی تک کا سفر درج ذیل مراحل سے گزر کر مکمل ہوتا ہے۔

(ا) الخاطر (Occurrence)

گناہ اور نافرمانی کے سب سے پہلے درجے کو ''الخاطر'' کہتے ہیں۔ یہ محض ایک خیال ہے جو دل سے گزر جاتا ہے۔ روز مرہ امور میں ہم یہ جملہ اکثر استعمال کرتے ہیں کہ 'میں اسے خاطر میں نہیں لاتا' یعنی میں اسے اتنی بھی اہمیت نہیں دیتا کہ اس کا خیال بھی

میرے دِل میں آئے۔ گویا خاطر ایک لہر (wave) یا جگنو کی روشنی کی طرح ایک ہلکی سی چمک ہے جو پل بھر کے لیے آتی اور گزر جاتی ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے کہ جب ہم کوئی چیز دیکھتے ہیں یا کسی چیز کی خواہش کرتے ہیں، تو اس کے بارے میں ہمارے دل میں کوئی طلب اور خیال پیدا ہوتا ہے جو دل سے صرف ایک لہر کی مانند یا اس سے بھی کم ایک ہلکی سی کرن کی طرح گزر جاتا ہے۔ پس ایک ایسا خیال جو ایک بار دل سے گزرے، اسے خاطر کہتے ہیں۔ یہ خیال جما ہوا یا پختہ نہیں ہوتا بلکہ دفعتاً دِل میں آتا اور گزر جاتا ہے۔

اِسی خاطر سے لفظ ''خطرہ'' ہے۔ خطرہ ایسے ڈر (fear) کا نام ہے جو کوئی موجودگی (existence) یا اظہار (appearance) نہیں رکھتا بلکہ خوف کا ایک ہلکا سا خیال ہوتا ہے۔ اسی خیال کو ہم خطرہ کہتے ہیں۔ ''خاطر'' کی اس لغوی وضاحت سے اس کی اصطلاحی تعریف واضح ہوتی ہے کہ برائی کا ایک ہلکا سا خیال جو ذہن میں آئے اور چلا جائے، اسے روحانی اصطلاح میں 'الخاطر' کہتے ہیں۔ گناہ کے عمل کے سفر کا آغاز خاطر سے ہوتا ہے۔ جب کوئی خیال آئے اور ہمارے دِل سے گزر جائے تو ہم اُس کا علاج نہیں کرتے، اُس پر توجہ نہیں دیتے کہ یہ خیال ہمارے دل سے کیوں گزرا ہے؟ ہم اسے ویسے ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ نتیجتاً یہیں سے برائی کے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ خیال ہمارے دل سے کیوں گزرا؟ اُس نے ہمارے دل و دماغ کو کیوں چنا؟ لازمی بات ہے کہ اس نے اس حوالے سے کوئی نہ کوئی کمزوری ہمارے اندر دیکھی، جس کی بناء پر اس نے یہاں سے گزرنے کا فیصلہ کیا۔ اگر ہمارا دِل مکمل طور پر محفوظ ہوتا، تو وہ خیال اس سے نہ گزر سکتا۔ لازمی بات ہے کہ خاطر کو جب کوئی جگہ اور راستہ ملا ہے تبھی وہ اس میں داخل ہوا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اِسی

مرحلے پر اس کا علاج کیا جائے اور دِل کو مردہ ہونے سے بچانے کے لیے اس کی حفاظت کے لیے اقدامات اٹھائے جائیں۔

جب برائی کا کوئی خیال ہمارے دِل میں آیا تو وہی موقع اس خیال کی روک تھام کرنے کا تھا کہ یہ خیال بھلا کیوں گزرا ہے؟ جب ہم اس خیال / خاطر کی روک تھام نہیں کرتے تو وہ خاطر سمجھتا ہے کہ میرا اِدھر دوبارہ آنے کا موقع بھی ہے۔ چونکہ بندہ اس قدر چوکس اور سمجھ دار نہیں ہے، لہٰذا ہمارا یہ دشمن ایک مرتبہ پھر ہمارے دِل سے گزرنے کے لیے حملہ کرتا ہے۔

یہ خاطر (occurrence of thougt) ہر دل، دماغ، قلب اور روح پر وارد ہوتا ہے۔ اولیاء، صالحین، عرفاء، اقطاب اور اغیاث؛ الغرض سب پر خواطر آتے ہیں۔ نیک اور صالح لوگوں پر آنے والے خواطر ملاء اعلیٰ کے نور سے نکلتے ہیں جبکہ بُرے لوگوں پر شیطانی خواطر آتے ہیں۔

(۲) حدیث النفس (Inclination)

دلوں کے مردہ ہونے کے سفر میں دوسرا مرحلہ "حدیث النفس" کا ہے۔ جو خواطر دل سے گزرتے ہیں تو وہ دل پر کچھ نشانات چھوڑ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر کیچڑ اور گیلی زمین پر گزرنے سے پاؤں کے نشان اس جگہ پر ثبت ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح کسی کے گھر میں کوئی چوری ہو جائے تو فنگر پرنٹ کے ذریعے چور تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اسی طرح انسان کا نفس اگر دل سے گزرے ہوئے کسی گناہ کے خیال، کسی خرابی کے خیال اور کسی چھپی ہوئی رغبت و لذت اور شہوت کے خیال کی طرف بار بار متوجہ ہوتا ہے، نفس بار بار اُسے دیکھتا ہے، اس خیال کی بات کرتا ہے، دماغ میں اس خیال کے چھوڑے ہوئے

نفس کی طرف مائل ہوتا ہے یعنی اُس خیال کا خیال کرتا ہے تو اسے حدیث النفس کہتے ہیں۔

وہ خیال جو ایک لمحے کے لیے آیا تھا اور گزر گیا، اگر وہ پلٹ کر دوبارہ کبھی آیا ہی نہیں تو اِس کا مطلب ہے کہ کہیں نہ کہیں اُس کی روک تھام ہو گئی ہے لیکن اگر اس کے گزرنے کے بعد بھی اُس کی صدا سنائی دے رہی ہے اور اُس کا خیال آ رہا ہے، تو اِس کا مطلب ہے کہ اس کی کہیں روک تھام نہیں ہوئی ہے۔ نفس اُس کے خیال میں تھوڑا سا محو ہو جاتا ہے اس چیز کو چاہنے لگتا ہے، اس کی بات کرتا ہے اور اس کی طرف رغبت پیدا ہو جاتی ہے۔ دِل کے اس معاملہ کو ''حدیث النفس'' کہتے ہیں۔

(۳)الھمّ (Thought)

دلوں کے مردہ ہونے کے سفر میں تیسرا مرحلہ ''الھمّ'' کا ہے۔ ''الھمّ'' کا مطلب ہے کہ اگر ''حدیث النفس'' کا سلسلہ جاری رہے، راستہ بند نہ پا کر خاطر دِل میں بار بار آتا رہے اور نفس کے اس خیال میں مشغول ہونے کے سبب اس نافرمانی اور گناہ کا خیال اتنی بار گزرے کہ وہ خیال دِل میں پختہ ہو جائے؛ اس خیال کا دل میں پختہ ہو جانا الھمّ کہلاتا ہے۔ یعنی الخاطر میں پہلے فقط گزرا تھا، پھر اس کا خیال آنے لگا، پھر اس خیال کا دورانیہ زیادہ ہوتا چلا گیا۔ اس طرح وہ تھوڑا تھوڑا دل میں گھر کرنے لگ گیا۔ جب اس نے دل میں گھر کر لیا اور پختہ ہو گیا تو اسے الھمّ کہا گیا۔

کچھ اسکالرز نے الھمّ کے لیے resolution کا لفظ استعمال کیا ہے جو کہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ الھمّ بہت ابتدائی نوعیت کی چیز ہے جب کہ resolution بہت آگے کی چیز ہے۔ خاطر جب دل میں رُک جاتا ہے اور کچھ جگہ پالیتا ہے اور انسان

اسے اپنا لیتا ہے تو اسے الھمّ (thought) کہتے ہیں۔ اسے مزید سمجھنے کے لیے حضور نبی اکرم ﷺ کے اس ارشادِ گرامی پر غور کرتے ہیں جس میں آپ ﷺ نے فرمایا ہے:

مَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كُتِبَتْ لَهُ حَسَنَةً. فَإِنْ عَمِلَهَا كُتِبَتْ عَشْرَ أَمْثَالِهَا، وَمَنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا لَمْ تُكْتَبْ عَلَيْهِ فَإِنْ عَمِلَهَا كُتِبَتْ سَيِّئَةً وَاحِدَةً(۱۲).

جس نے نیکی کا دل میں خیال کیا مگر اس پر عمل نہ کیا تو اس کے لیے ایک نیکی لکھی جائے گی؛ اگر اس نے اس نیکی پر عمل کر لیا تو دس نیکیاں لکھی جائیں گی۔ جس نے گناہ کا دل میں خیال کیا مگر اس پر عمل نہ کیا تو اس کے لیے گناہ نہیں لکھا جائے گا لیکن اگر اس نے گناہ کر لیا تو اس کے لیے ایک گناہ ہی لکھا جائے گا۔

اکثر لوگ ترجمہ کرتے ہوئے "ھمّ" کا ترجمہ "ارادہ" کر دیتے ہیں جو کہ درست نہیں ہے۔ "ھمّ" اور "ارادے" میں فرق ہے۔ نیکی یا بدی کے دل میں پختہ ہونے سے پہلے دو مراحل گزر چکے ہیں۔ ھمّ کے درجے میں پہنچ کر بندہ نیکی کا خیال اپنا لیتا ہے۔ پہلے دل سے نیکی کا خاطر گزرا، پھر دل میں اس کے بارے میں رغبت پیدا ہوئی اور اب دل اس نیکی کے خیال پر جم گیا۔

یہ امر ذہن نشین رہے کہ ابھی نیکی کے کام کا خیال کیا ہے، اس پر عمل نہیں کیا۔ عمل تو آخری درجہ اور منزل ہے۔ ارادہ تو ابھی بہت آگے چل کر آنا ہے، بندہ ابھی تو

(۱۲) الدارمي، السنن، ۱/ ۲۰۹، الرقم/۲۸۲۸.

ارادے تک پہنچا ہی نہیں ہے۔ محض ایک خیال ہے، ھمّ ہے۔ اگر ذہن بدل گیا اور بندہ وہ کام نہ بھی کر سکا تب بھی اس پر آپ ﷺ نے امتِ مسلمہ پر رحمت و شفقت کے باعث اجر کی نوید سنادی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ھمّ بھی ایک حقیقت ہے، اسی لیے تو اس پر بھی اجر مل رہا ہے۔ ورنہ بلا حقیقت شے پر اجر نہیں ملتا۔ کیونکہ اجر ایک حکم ہے اور حکم کسی ایسی شے پر مرتب ہی نہیں ہوتا جو حقیقت میں وجود ہی نہ رکھتی ہو۔ اگر ھمّ پر اجر مل رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ھمّ میں کچھ ہے کہ اس پر شریعت کا حکم مرتب ہو رہا ہے اور اجر مل رہا ہے۔

اسی طرح فرمایا کہ جس نے گناہ کا ھمّ (خیال) کیا مگر گناہ نہ کیا تو اسے بھی ایک نیکی مل جائے گی۔

لطیف نکتہ

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ فرق کس بنیاد پر ہے کہ نیکی کا خیال کیا مگر نیکی کی نہیں اور اجر مل گیا؛ برائی کا خیال کیا مگر برائی کی نہیں، اس پر ایک نیکی لکھ دی گئی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اسے بھی برائی کا کچھ درجہ لکھا جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا، بھلا کیوں؟ اس کا ایک سبب تو اللہ رب العزت کی اپنے بندوں پر سخاوت ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ یہ اللہ رب العزت کی scheme of application ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہمیں روحانی طور پر طاقتور کرنے کے لیے ہماری حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اس کا مقصد یہ اجاگر کرنا ہے کہ اے انسان! تیرے اندر اتنی خوبی تو ہے، تیرا دل و دماغ اتنا سازگار تو ہے کہ اس میں نیکی کا خیال آیا اور تو نے نیکی کے بارے میں سوچا تو سہی؛ اس لیے اس پر تیرے لیے اجر ہے۔ دوسری طرف برائی کا خیال تیرے دِل میں آیا مگر تو نے اس برے خیال کو عملی شکل نہ

دی، اس لیے اس میں بھی تیرے لیے نیکی ہے۔ گویا یہاں بنیادی طور پر نیکی کی خواہش کو اجاگر کیا گیا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر دل و دماغ، طبیعت اور مَن کو اتنا پاک اور صاف ستھرا رکھا جائے کہ ان میں نیکی کرنے کا خیال اور خواہش آجائے تو اسے بھی سراہا گیا ہے کہ اے میرے بندے! تو نے اپنے دل و دماغ کے اندر کا ماحول اتنا سازگار بنا رکھا ہے کہ اس میں نیکی کا خیال تو آیا اور نیکی کے خیال کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ بشری کمزوریوں کے سبب تو اسے کر نہیں سکا۔ یہ الگ بات ہے لیکن چلیں جتنا بھی خیال آیا ہے، اس کو بھی appreciate کرتے اور سراہتے ہوئے نیکی لکھ دی ہے تاکہ آئندہ کبھی کسی وقت میں نیکی کا خیال آئے تو تم اس پر عمل بھی کر سکو۔

دوسری طرف برائی کا خیال کیا مگر برائی نہیں کی تو اس پر بھی نیکی دے کر تمہیں سراہتے ہیں کہ اے بندے! یہ درست ہے کہ برائی کے خیال کو پہلے ہی مرحلے پر روک نہ سکا اور یہ خیال دل و دماغ میں آگیا۔ چلو کوئی بات نہیں، بشر ہونے کے ناتے ایسے خیالات دِل و دماغ میں آہی جاتے ہیں۔ تیرے اس عمل پر بھی کہ تو نے گناہ کے خیال کے باوجود گناہ اور برائی نہیں کی، نیکی اس لیے دی کہ تیرے اندر اتنی استقامت تو ہے کہ تو نے خیال آنے کے باوجود اس گناہ کو عمل میں آنے سے پہلے روک لیا۔ اس گناہ کو نفس سے روکنے پر تجھے appreciate کیا جا رہا ہے، یعنی بندے نے گناہ کو ہونے نہیں دیا تو اس کے اس عمل کو بھی نیکی شمار کر لیا کہ اس کا دل اَلھمّ کی حد تک ہی سہی، مگر نیکی کی طرف راغب اور گناہ سے اجتناب تو کیا۔ یعنی دل نے برے خیال کو عمل بننے سے پہلے ہی جھٹک کر نکال دیا۔

"الخاطر" سے "الھمّ" تک یہ سب کچھ دل کے اندر ہو رہا ہے۔ پہلے فقط خیال گزرا، اسے 'الخاطر' کہا گیا؛ پھر اس خیال کی گونج نفس میں سنائی دینے لگی، جسے 'حدیث النفس' کہا؛ پھر وہ خیال پختہ ہونے لگا تو اسے 'الھمّ' کہا گیا۔

(۴) الفکر (Desire)

'الھمّ' کے بعد دل کے مردہ ہونے کا چوتھا مرحلہ 'الفکر' ہے۔ فکر، خواہش کو کہتے ہیں۔ الھمّ اُس کی سوچ تھی۔ اب اس مرحلہ پر اس کی سوچ خواہش اور چاہت میں بدل گئی ہے۔

کوئی بھی عمل بڑے باریک فرق کے ساتھ اِن مراحل سے گزرتا ہے۔ خواہش (desire) کے مرحلہ یعنی فکر کا کافی زیادہ وقت تک دل میں قیام پذیر رہتا ہے۔ اس دوران بندہ مشقت میں پڑا رہتا ہے۔ وہ خواہش کے خلاف جنگ کرتا ہے؛ اسے نکالنا چاہتا ہے لیکن چونکہ وہ اب سوچ (thought) سے بھی بڑھ کر خواہش (desire) بن چکی ہے، لہٰذا اب وہ کچھ حد تک دل میں بھی جڑ پکڑ چکی ہے۔ یہ انسان کی غفلت ہے کہ اُس نے اسے اس مرحلے (stage) تک آنے دیا۔ جب وہ خیال اندر چھپی ہوئی ایک خواہش (desire) بن جاتا ہے، تو اُس وقت اُسے ختم کرنا، اُس کی جڑوں (roots) کو کاٹنا، اُسے نکالنا اور اکھاڑنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ فکر بننے سے پہلے تین مراحل گزر چکے ہیں، اب چوتھا مرحلہ آ گیا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ شروع میں جب 'خاطر' آیا تھا اُسی وقت اُس پر توجہ دی جاتی کہ یہ خیال کہاں سے آیا ہے؟ اچانک بُرائی کا خیال آنا بھی ایک sudden occurrence ہوتی ہے، اُس کی اسی وقت بیخ کنی کرنا آسان ہوتا۔ جس

مقام پر جو کام بندے کو کرنا چاہیے جب بندہ اُس مقام پر غفلت برتتا ہے اور وہ وقت گزر جاتا ہے تو بعد میں بندہ اس مشکل میں پھنس جاتا ہے۔

اولاد کی تربیت میں کوتاہی

یہاں ضمناً واضح کرتے چلیں کہ اولاد کی تربیت کے معاملے میں کوتاہی کا تعلق بھی انہی مراحل میں سے ہے۔ والدین کو جس سطح پر انہیں ایک خاص ماڈل میں ڈھالنا تھا، ان کی تربیت کرنی تھی، اُنہیں جائز و ناجائز کا فرق سکھانا اور نیک راستے پر لگانا تھا، وہ وقت اور مرحلہ تو بچے کے ساتھ لاڈ پیار اور لاپروائی میں گزار دیتے ہیں اور حقوق و فرائض میں توازن نہیں کرپاتے۔ جب وہ مرحلہ (stage) گزر جاتا ہے اور بچے بچیاں گیارہ، بارہ سال کی عمر تک پہنچ جاتے ہیں تو پھر ان کی تربیت کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ اب اُن کی عادت پختہ ہو جاتی ہے۔ وہ اب 'خاطر' سے بھی گزر چکے ہیں، 'حدیث النفس' سے بھی، 'ھم' کے مرحلے سے بھی اور اب 'فکر' کے مرحلے میں آ گئے ہیں۔ یعنی اُن کی کچی یا پکی، غلط یا صحیح سوچ بن چکی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم مرحلۂ فکر پر اُن بچے بچیوں کو روکتے ہیں تو وہ ناپسند کرتے ہیں کیونکہ اب اُن کی تربیت کا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔

اِس لیے بچوں کی تربیت شروع سے کرنی چاہیے تاکہ بعد میں مسئلہ نہ ہو۔ جب بچے انگلیاں پکڑ کر چلنے والے ہوں تو اُس وقت اُن کو ساتھ محافل اور دروس میں لانا چاہیے تاکہ اُن کی بہتر تربیت ہو سکے۔ انہیں اپنی راہ پر چلایا کریں اور اس حوالے سے بھی اُن کا خیال رکھا کریں۔ جب وہ دس، بارہ سال کی عمر میں پہنچ جائیں تو وہ صاحبِ فکر ہو جاتے ہیں اور اُن کی فکر بن چکی ہوتی ہے۔ جب وہ بڑی عمر کو پہنچ جائیں گے تو آغاز ہی میں بن جانے والی فکر پر چل پڑیں گے۔ اس مرحلے پر تعویذ اور دعا سے کام نہیں چلتا۔ پھر ہم پریشان

ہوتے ہیں کہ بچہ، بچی کہنا نہیں مانتے، ہمارے قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں، لیکن اب اس شکایت کا بھلا کیا فائدہ؟ ایسی شکایت اور گلہ کرنے والے والدین نے چونکہ اللہ کا حکم نہیں مانا ہوتا، تو اب اُن کی اولاد ان کا کہنا کیوں مانے۔

اِسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ قُوٓاْ أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا﴾(۱۳)

اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے بچاؤ۔

اس موقع پر اولاد کی تربیت کی مثال دینے کا مقصد یہ ہے کہ ہر شخص اس مرحلے سے گزرتا ہے۔ ہمارے اندر بھی ایک بچہ ہوتا ہے جو کچھ وقت مرحلۂ خاطر میں گزارتا ہے۔ اس مرحلے پر ہم اس پر توجہ نہیں دیتے تو وہ "حدیث النفس" کے مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے، جس کی صدا اور بازگشت دل و دماغ کی وادیوں میں گونجتی ہے۔ اس موقع پر بھی ہم اس کی پروا نہیں کرتے اور یہ مرحلہ بھی گزرنے دیتے ہیں۔ پھر وہ خیال دل و دماغ میں جم جاتا ہے۔ خاطر تو ایک مہمان تھا جو آیا اور گزر گیا مگر فکر تو دل و دماغ میں یوں گھر کر لیتا ہے، جیسے: اس نے ہمارے دل و دماغ کو کرائے پر حاصل کر لیا ہو۔ طویل عرصہ دل میں قیام پانے کی وجہ سے خیال اب محض خیال نہیں رہا بلکہ خواہش بن چکا ہے اور اب دل و دماغ اور طبیعت بھی اسے چاہنے لگے ہیں اور اب وہ خیال فکر اور خواہش سے بھی اگلے مرحلے میں داخل ہونے کے لیے تیار ہو چکا ہے۔

---

(۱۳) التحریم، ٦٦/ ٦.

(۵) اِلارادۃ (Will)

الفکر (desire) کے بعد پانچواں مرحلہ 'الارادہ' کا آتا ہے۔ اس مرحلے پر خواہش انسان کا ارادہ (will) بن جاتی ہے۔ وہ خواہش (desire) اب حرکت اور فعل میں تبدیل ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس مرحلے سے ایک حرکت کا آغاز ہوتا ہے۔ خواہش و فکر میں حرکت کا شروع ہونا ارادہ کہلاتا ہے۔ یعنی وہ چاہت یہ چاہتی ہے کہ اب عملی اور جسمانی طور پر میرا ظہور ہو۔

اللہ رب العزت نے جب کائنات کی مختلف چیزوں کو عدم سے وجود میں لانے کی بات کی تو وہاں بھی لفظِ ارادہ کہا ہے۔

اس حوالے سے ارشاد فرمایا ہے:

﴿إِنَّمَآ أَمۡرُهُۥٓ إِذَآ أَرَادَ شَيۡـًٔا أَن يَقُولَ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ﴾(١٤)

اس کا امر (تخلیق) فقط یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کو (پیدا فرمانا) چاہتا ہے تو اسے فرماتا ہے ہو جا، پس وہ فوراً (موجود یا ظاہر) ہو جاتی ہے (اور ہوتی چلی جاتی ہے۔)

جو خیال ساکن پڑا ہوتا ہے اور طبیعت اُس سے مانوس ہو جاتی ہے، اسے حرکت دے کر انسانی جسم، طبیعت اور زندگی میں فعل کی صورت میں منتقل کرنے اور آگے

---

(١٤) یس، ٣٦/ ٨٢.

بڑھنے کی خواہش 'ارادہ' کہلاتی ہے۔ یہیں سے مشکل مرحلہ شروع ہو جاتا ہے، جسے آغاز کی نسبت قابو کرنا بہت زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ اِسی لیے کہتے ہیں کہ بُرائی کو شروع ہی سے روکنا چاہیے۔ جب اُس کی جڑیں مضبوط ہو گئیں، تو پھر اسے روبہ عمل ہونے سے روکنا مشکل ہو جائے گا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ آغاز ہی میں اس کی جڑ نکال کر پھینک دیں تاکہ وہ چیز ختم ہو جائے۔

(۶) الرضا (Acceptance)

ارادہ کے بعد "الرضا" کا مرحلہ ہے۔ ارادہ اُس وقت رضا بنتا ہے جب اس میں خوشی کا احساس بھی شامل ہو جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہمارے وجود اور داخلی احساسات (internal feelings) نے اس ارادے کو قبول کر لیا ہے۔ یعنی اب اس کام کو سرانجام دینے کے لیے مَن میں راحت، سکون اور اطمینان پیدا ہو چکا ہے۔ جس ارادے کے پیچھے فکر اور خیال کھڑے ہوں، اس کی انجام دہی میں جب خوشی اور قبولیت کے جذبات بھی شامل ہو جائیں، تو اسے رضا کہتے ہیں۔

(۷) الاختیار (Preference of choice)

دِلوں کے مردہ ہونے کے سفر میں ساتواں مرحلہ "الاختیار" کا آتا ہے۔ اختیار کو عام طور پر انتخاب کہہ دیتے ہیں لیکن یہ انتخاب نہیں ہے بلکہ یہ preference of choice ہے۔ انتخاب (choice) تو پہلے بندہ کر چکا ہے۔ انتخاب تو بندے نے 'الھم' اور 'فکر' کے درمیان کر لیا تھا، تبھی تو ارادہ کیا۔ پھر وہ بندہ ارادے (will) کے بعد رضا (acceptance) پر بھی آ گیا۔ رضا سے گزر کر اب انتخاب نہیں رہا بلکہ اب یہ اختیار

(preference of choice) ہے۔ یعنی جس چیز کو اُس نے choose کر لیا ہے، اب اسے prefer بھی کر رہا ہے اور اُس پر اطمینان کا اظہار کر رہا ہے۔ پس یہ self-willingness ہے۔ یعنی اُس کے باطن اور دھیان میں اب یہ پختہ ہو گیا ہے اور باقی تمام چیزوں پر اسے ترجیح (preference) دے دی ہے۔ اس preference کو اِختیار کہتے ہیں۔

۸۔النیّۃ (Intention to act)

"الاختیار" کے بعد النیّۃ کا مرحلہ (stage) آتا ہے۔ نیت کو intention کہتے ہیں۔ عام طور پر ہم لفظ intention، ارادے کے لیے استعمال کرتے ہیں، یہ درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ ارادے کے لیے will کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ "ارادہ" کے بعد "رضا" ہے، اس کے بعد "اختیار" اور پھر اُس کے بعد "النیّۃ" (intention) ہے۔

اس مرحلے پر نیت اس چیز کی ہوتی ہے کہ جو خیال، ارادہ، خواہش، پسند اور ترجیح ایک عرصے سے چلی آ رہی تھی۔ اب وہ ایسے مقام پر پہنچ گئی ہے کہ بندے نے اسے عملی شکل دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اِسے نیت کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب ہم نماز پڑھتے ہیں تو اس کے لیے پہلے تیاری کرتے ہیں؛ اٹھتے ہیں؛ وضو کرتے ہیں اور پھر سنتیں پڑھتے ہیں، لیکن فرائض کی نیت بالکل شروع میں نہیں کرتے، بلکہ عین اس وقت کرتے ہیں جب تکبیرِ تحریمہ کہنا ہوتی ہے۔ اس لیے کہ نیت فعل کی عملی شکل اور ادائیگی سے پہلے کی جانے والی آخری چیز ہوتی ہے۔ حالانکہ پچھلے سارے مراحل کی سمت وہی ہوتی ہے مگر وہ مراحل نیت میں شمار نہیں ہوتے۔

نیت کے معاملے میں احناف، شوافع اور دیگر مذاہب میں فرق ہے۔ احناف نے زبان کی نیت کو سنت اور دل کی نیت کو واجب کہا ہے۔ شوافع کہتے ہیں کہ صرف دل سے نیت کر لی تو کافی ہے؛ زبان سے الفاظ بولنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ نیت الفاظ پر مشتمل ہے یا صرف دل کے فیصلے پر مشتمل ہے۔ بہر کیف نیتِ قلبی بھی کافی ہے جو کہ آخری لمحے میں عمل شروع کرنے سے پہلے اس وقت کی جاتی ہے جب سارے مراحل مضبوطی سے مکمل ہو چکے ہوتے ہیں۔

(۹)العزیمة(Determination)

نواں مرحلہ (stage) العزیمة ہے۔ اسے عزم بھی کہتے ہیں۔ صوفیا کرام بعض اوقات الھمة کا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں مگر عزم اور عزیمةسے مراد firmness اور resolution ہے۔ اس عزیمة (determination) کا مرحلہ نیت (intention) کے بعد ہے۔ یہ نیت میں ایسی firmness کا اضافہ ہے جو اُس نیت کو مضبوط کر دیتا ہے۔ گویا نیت میں مضبوطی عزیمة(determination) کہلاتی ہے۔

(۱۰)القصد(Final decision)

دراصل "القصد" دِلوں کی موت کے سفر کا دسواں مرحلہ ہے۔ عام طور پر اکثر لوگ "قصد" کا اردو ترجمہ "ارادہ" کرتے ہیں۔ دیگر زبانوں کے مقابلے میں اردو کا دامن بہت وسیع ہے۔ انگریزی کے مقابلے میں تو بہت ہی زیادہ وسیع ہے لیکن جب یہ عربی کے مقابلے میں آتی ہے تو اس کا دامن تنگ ہو جاتا ہے۔ عربی میں ایک ایک لفظ کی

محض کیفیت کے بدلنے کے ساتھ خطاب اور اصطلاح بھی بدل جاتی ہے جبکہ اردو اِن سب چیزوں کا احاطہ نہیں کرتی۔ اِس لیے ''القصد'' کا مطلب ارادہ نہیں ہے بلکہ القصد، حتمی فیصلے (final decision) کو کہتے ہیں۔

(۱۱) الفعل (Act)

مذکورہ بالا مراحل ایسے ہیں جو دل اور باطن میں چلتے ہیں مگر نظر نہیں آتے اور انسان ان کے درمیان کشمکش کا شکار رہتا ہے۔ وہ خیال جو خاطر سے چلا تھا، وہ مذکورہ دس مراحل کے بعد عمل میں تبدیل ہو جاتا ہے، اسے فعل کہتے ہیں۔ یہ گیارہواں مرحلہ ہے۔ پہلے دس مرحلے دل و دماغ کے اندر چلتے ہیں اور دل و دماغ ان میں مبتلا رہتے ہیں۔ گیارہویں مرحلے پر اس کا عملی اظہار (physical appearance) ہو جاتا ہے۔ اب وہ فعل جو اس سے صادر ہوا ہے، اس کے اچھے یا برے ہونے کے مطابق بندے کے دل پر نور یا سیاہی آ جاتی ہے۔

۴۔ خلاصۂ کلام

فعل صادر ہونے سے پہلے تک دل میں وارد ہونے والے پورے دس مراحل میں جو کچھ تھا، اللہ تعالیٰ اس پر معافی دے دیتا ہے۔ مگر جب بندے نے اس کو فعل کی شکل دے دی اور وہ گناہ یا نیکی کی شکل میں ظاہر (appear) ہو گیا اور عمل بن گیا، تو اب اس کے اوپر اگر نیکی کا عمل تھا تو جزا اور اگر بدی کا عمل تھا تو سزا لکھ دی جاتی ہے۔

نیکی کے خیال پر اجر اس وقت شروع ہو جاتا ہے جب وہ الھَمّ کے درجے پر تھا، مگر گناہ کے خیال پر دس مرحلے گزرنے تک گناہ نہیں لکھا جاتا لیکن جب وہ خیال فعل

اور عمل کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اس کے لیے ایک گناہ لکھ دیا جاتا ہے۔ بعد ازاں اگر اِس فعل و عمل میں تسلسل آ جائے اور زندگی اس کے ساتھ گزرنے لگ جائے تو اسے سیرت (character)، رویہ (behaviour) اور کردار کہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اب یہ رویّے اور اعمال زندگی میں اُس کی عادت میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

باب سوم

حفاظتِ قلب
اور
محافظینِ قلب کے درجات

قلوب موت کا شکار کیسے ہوتے ہیں اور کن مراحل سے گزر کر انسان کسی برائی یا نیکی کے کام کو سرانجام دینے کے قابل ہوتا ہے؟ اِن امور کے مطالعے کے بعد آیئے ہم اب اس امر پر غور کرتے ہیں کہ حفاظتِ قلب کس طرح ممکن ہے اور محافظینِ قلب کو اللہ رب العزت کی طرف سے کن درجات پر فائز کیا جاتا ہے۔

ا۔ محافظینِ قلب کے درجات

خیال دل کے اندر درج بالا دس مراحل سے گزر کر عملی شکل اختیار کرتا ہے۔ واضح رہے کہ اگر خیال اچھا ہو تو اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے اور اگر برا ہو تو اس کے خاتمے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اللہ رب العزت نے حضور نبی اکرم ﷺ کے وسیلے سے امتِ مسلمہ کو آسانی، رحمت اور شفقت کے ایسے ایسے درجات سے نوازا ہے کہ انسانی عقل اس کا احاطہ ہی نہیں کر سکتی۔ انسان جس جس مرحلے پر خود کو گناہ اور نافرمانی سے بچاتا ہے، اللہ تعالیٰ ہر ہر مرحلے پر اس کے درجات میں مختلف انداز سے اضافہ فرماتا چلا جاتا ہے۔ مذکورہ دس مراحل میں سے جس مرحلے پر بھی انسان برے خیال کو عمل میں بدلنے سے قبل روکے گا، اُسے ہر مرحلے پر روکنے کا الگ اجر اور درجے سے نوازا جائے گا۔

اِن درجات کا تذکرہ ذیل میں کیا جارہا ہے:

(۱)عابدین

اگر کوئی شخص برے خیال کو مرحلہ ٔفعل پر جا کر روک لے، گناہ کے عمل کو ترک کر دے اور اس فعلِ بد کا ظہور نہ ہونے دے، تو ایسے بندوں کو عابدین کا مقام ملتا ہے۔ اگر وہ بندہ گناہ کرتا تو اس کے دل پر سیاہی پھیلنا تھی، شقاوت اور سختی آنا تھی اور دل نے موت کی طرف جانا تھا مگر اس نے ابتدا ہی میں روک لیا۔ یہ عام مؤمنین اور عبادت گزاروں کا مقام ہے کہ وہ عمل کرنے سے پہلے کسی مرحلے پر نہ رُک سکے، مگر آخری لمحہ میں انہوں نے خود کو روکتے ہوئے، دل کو مزید نقصان، شقاوت اور سیاہ ہونے سے بچا لیا۔ یعنی فعل بننے اور عمل صادر ہونے سے پہلے ہی رُک جانا عابدین کا شیوہ ہے۔

(۲) مجتہدین

اگر کوئی شخص اپنے دل کو ایک درجہ اور پہلے ''القصد'' کے مرحلے پر روک لے اور دل کو گناہ کے حتمی فیصلے تک نہ پہنچنے دے تو ایسے بندے کو مجتہد کا درجہ ملتا ہے۔ ''الفعل'' کے درجے پر روکا تھا تو عام عبادت گزار تھا اور اگر ''القصد'' کے درجے پر روکے تو یہ مجتہد کا درجہ ہے۔

(۳)منیبین

اگر کوئی شخص اس خیال کو ''العزیمۃ'' کے مرحلے پر روک لے اور نیت کو گناہ پر پختہ نہ ہونے دے اور قلب کی اس مرحلہ پر حفاظت کر لے تو یہ انابت یعنی منیبین کا درجہ ہے جو کہ توبہ سے اوپر کا درجہ ہے۔

(۴)زاہدین

اگر کوئی شخص العزیمة سے مزید اوپر اپنے خیال اور دل کو "النیّة" کے درجے پر روک لے اور کسی بری خواہش اور برے خیال کو دل میں ترجیح حاصل نہ کرنے دے تو یہ زاہدین کا درجہ ہے۔

(۵)متقین

اگر کوئی شخص النیّة سے بھی اوپر اپنے خیال کو "الاختیار" کے مرحلے پر روک لے اور دل میں اس خیال کو جمنے نہ دے اور نہ ہی ترجیح پانے دے تو یہ متقین کا مقام ہے۔

(۶)مریدین

اگر کسی شخص نے "الإرادة" اور "الرضا" کے مرحلے پر اس خیال کو روک لیا تو یہ مریدین کا درجہ ہے۔ ان لوگوں کو مریدین اس لیے کہتے ہیں کہ یہ گناہ کی خواہش کو پسند نہیں کرتے۔

(۷)مخلصین

اگر کسی نے "الفکر" کے درجے پر خیال کو روک لیا اور دل کی حفاظت کر لی تو یہ مخلصین کا درجہ ہے۔

(۸)اوّابین

اگر کسی نے اَلھمّ کے مرحلے پر خیال کو روک لیا اور اپنے دل کی حفاظت کرلی تو یہ اَوّابین کا درجہ ہے۔

(۹)مقربین

اگر کسی شخص نے "حدیث النفس" کے مرحلے پر خیال کو روک لیا اور دل کی حفاظت کرلی تو یہ مقربین کا درجہ ہے۔ اس درجے سے ولایت شروع ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے حدیث النفس کے مرحلے پر ہی تنبیہ حاصل کرلی۔ دوسرے لفظوں میں وہ بیدار ہو گیا جیسا کہ اولیاء اللہ بیداری میں رہتے ہیں اور ہمہ وقت اپنے نفس کی نگرانی (supervision) کرتے رہتے ہیں۔ اگر ایک بار خیال آگیا تو اللہ تعالیٰ گرفت نہیں کرتا لیکن اگر دوبارہ آجائے تو وہ حدیث النفس ہے۔ اونچے درجے کے اولیاء جو مقربین کے زمرے میں شامل ہیں، وہ خیال کو اسی درجے پر روک لیتے ہیں۔

(۱۰)صدیقین

اگر کسی شخص نے "الخاطر" کے مرحلے پر ہی خیال کو روکتے ہوئے جھٹک دیا اور دل کی حفاظت کرلی تو یہ سب سے اونچے درجے کے اولیاء یعنی صدیقین کا درجہ ہے۔

یہ حفاظتِ قلب کا افضل ترین درجہ ہے جس پر اولیاء اللہ اور اللہ تعالیٰ کے محبوب اور مقرب دوست عمل پیرا ہوتے ہیں۔ وہ خواطر پر نگاہ رکھتے ہیں۔ لہٰذا جوں ہی گناہوں کے خواطر کی پہلی چمک آتی ہے تو وہ اُسی وقت اُس کا مؤاخذہ کرتے ہیں اور قلب کو محفوظ کر لیتے ہیں تاکہ وہ خیال دوبارہ اِدھر کا رخ نہ کرے، نفس اُس خیال کی طرف

رجحان نہ کر سکے، اُس کی آواز نفس کی وادیوں میں سنائی نہ دے اور حدیث النفس نہ ہو۔ گویا وہ اگلی نوبت تک نہیں آنے دیتے۔

۲۔ حفاظتِ قلوب کا صحیح وقت

قلوب کی حفاظت کی محفوظ ترین صورت یہ ہے کہ آدمی ہمہ وقت نگاہ رکھے کہ دل میں کیا خیال گزرا ہے، اُسے اُسی وقت وہیں روکیں۔ اگر اُسی وقت اسے یہ سوچ کر نہ روکا کہ یہ پہلی stage ہے، حفاظت کی ضرورت نہیں ہے، دوسرے مرحلے پر حفاظت کر لیں گے تو پھر ایک ایسا مقام بھی آتا ہے کہ ان پر ہمارا کنٹرول نہیں رہتا۔ یاد رکھیں! ہم نے نفس کی چوکیداری کرنی ہے، ہم جب نگہبانی نہیں کرتے، گارڈ بن کر حفاظت نہیں کر رہے ہوتے تو دلوں کو مردہ اور سیاہ کرنے والی چیزیں step by step بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ پھر ایک ایسی stage آتی ہے کہ اس پر ہمارا کنٹرول نہیں رہتا۔

لہٰذا ہم میں سے ہر ایک کو اپنے دل کا چوکیدار بننا ہو گا۔ دوسرے لفظوں میں اپنے دل، دماغ اور روح کی نگرانی خود کرنا ہو گی۔ جو خیال پہلی بار آیا ہے اُس کا مواخذہ اسی وقت کیا جائے، اسے روکیں اور اپنا دفاع کریں۔

یاد رکھیں! پہلی جنگ سرحد (border) پر ہی ہوتی ہے۔ اگر خاطر آئے تو وہیں پر دفاع کر لیا جائے تاکہ بار بار آکر حدیث النفس نہ بنے۔ حدیث النفس دوسری defence line ہے، الھمّ تیسری defence line ہے، الفکر چوتھی defence line ہے، ارادہ پانچویں defence line ہے، رضا چھٹی defence line ہے، اختیار ساتویں defence line ہے، النیّة آٹھویں defence line ہے، عزم، عزیمة نویں defence line ہے، قصد دسویں defence line ہے اور اُس کے بعد پھر فعل

صادر ہو جاتا ہے۔ اللہ کا کرم دیکھیے کہ گناہ ہو بھی جائے تب بھی اُس نے defence line دی ہے اور وہ توبہ ہے۔ گویا گناہ کرنے کے بعد بھی انسان واپس پلٹ جائے تو وہ بندے کی ساری کمزوریوں کو جانتے ہوئے بھی گناہ معاف کر دے گا پھر بھی افسوس کہ بندہ اپنے آپ کو آزمائش میں ڈالتا ہے۔

لٰہذا ہمیشہ خواطر، حدیث النفس، الھم، فکر، ارادہ، رضا، اختیار، یعنی پہلی سات defence lines کی اپنی اپنی طاقت کے مطابق حفاظت کریں۔ یہ تمام امور کرنے سے ہوں گے، محض دعا اور دم یا زیارت کرنے سے نہیں۔ اگر خالی زیارت اور دعا سے سارا defence ہو جاتا تو اولیاء کرام اِن چیزوں کا کبھی ذکر ہی نہ کرتے۔ وہ ایک ہی بار کہہ دیتے کہ صرف زیارت کر لیا کرو، سارے defence اپنے آپ ہوتے چلے جائیں گے۔ زیارت، صحبت، دعا، عقیدت، تعلق، محبت، پیروی یہ ساری چیزیں defence کو مضبوط کرتی ہیں۔ مگر defence تو ہم نے اپنے عمل سے خود کرنا ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے پاس نہ اینٹیں ہیں، نہ سیمنٹ تو کیا محض زیارت، صحبت، رفاقت، عقیدت اور محبت سے مکان تعمیر ہو جائے گا۔ افسوس! آج امتِ مسلمہ کی روش یہ ہے کہ ہم اینٹیں رکھنے اور دیوار بنانے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ سارا کام عقیدت ہی سے مکمل ہو جائے۔ اگر ہم نے اینٹیں ہی نہیں رکھیں تو اکیلا سیمنٹ کیا کرے گا؟ جن چیزوں پر ہم تکیہ کرتے ہیں وہ بمنزلہ سیمنٹ ہیں اور ہماری کاوشیں (چوکیداری، نگرانی، طاعت گزاری) بمنزلہ اینٹیں۔ جب اینٹیں ہم رکھیں گے تو کوئی سیمنٹ لگائے گا جس سے دیوار پکی ہو جائے گی۔

خاطر / خواطر اچھے بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی۔ اگر کوئی بُرا خطرہ لاحق ہوا تو اُسے روکنے کے لیے treatment چاہیے۔ اگر اچھا خطرہ آیا تو اُس کی حفاظت کرنے اور فروغ دینے کے لئے بھی treatment ہی چاہیے۔

۳۔ قلب کی نگہبانی اور پاسبانی کا مفہوم

دل کی نگہبانی و نگہداشت کیے بغیر نیکی کے خواطر کو پروان نہیں چڑھایا جاسکتا اور نہ ہی بدی اور گناہ کے خواطر سے بچنا ممکن ہے۔ جب اچھا خیال آئے تو اس کی نگہبانی کرکے اسے پروان چڑھانا ہے اور جب برا خیال آئے تو دل کو اس کی تباہ کاریوں سے بچانا ہے۔

دل کی پاسبانی، نگہداشت اور نگہبانی کے مفہوم کو اس مثال سے سمجھیں کہ نگہبان محافظ ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ ہم گلی میں چوکیدار بن کر بیٹھے رہیں اور چور ہمارے سامنے سے چوری کرکے بھاگ جائیں۔ ہمارا یہ طرزِ عمل چوکیداری نہیں کہلائے گا۔ چوکیدار کا مطلب محض بیٹھے رہنا نہیں ہوتا بلکہ حملہ کرنے والے اور چوری کرنے والے کو روکنا بھی ہوتا ہے۔ اگر چپ چاپ بیٹھے رہیں گے تو وہ چور چوری کرکے چلتا بنے گا اور ہماری ایسی چوکیداری کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو گا۔

لہٰذا اگر بُرا خیال آئے تو اسے روکنے کے لیے ہمت کرنی ہے اور کچھ defence، تاکہ وہ خیال دوبارہ نہ آسکے۔ اسی طرح اگر اچھا خیال آئے تو اُس کی حفاظت کرنا ہے۔ اس اچھے خیال کی ایک چمک اور ایک کرن کے تصور کو مضبوط کرنا اور اس پر بار بار توجہ مرکوز کرنا ہے کہ وہ کرن تھوڑی دیر کے لیے دوبارہ آجائے اور پہلے کی نسبت زیادہ دیر تک رک جائے۔ پھر اسے مزید اور لانے کی کوشش کرنی ہے۔ شروع میں ایسے

ہی ہوتا ہے کہ جب یہ روشنی آنا شروع ہوتی ہے تو پہلے جگنو کی چمک کی طرح آتی ہے، پھر ہم محنت کرتے ہیں، چوکیدار بن کر کوشش کرتے ہیں، اُسے دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو پہلے جو ایک لمحے کے لیے آئی اور چلی گئی تھی، پھر اس کا دورانیہ زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ جب ہماری effort مزید جاری رہتی ہے تو وہ چمک پہلے سے زیادہ دیر تک رہتی ہے۔ اس روشنی کا آنا اِس بات کی دلیل ہے کہ جو آئی ہے وہ رہ بھی سکتی ہے اور اگر تھوڑے وقت کے لیے رہ رہی ہے تو وہ زیادہ وقت کے لیے بھی رہ سکتی ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو قلب کے اُس نور کے ساتھ پوری عمر جیتے ہیں اور یہ نور اُن کی زندگی کا لازمی جزو بن جاتا ہے۔

۴۔ کیفیت، حال اور مقام کی وضاحت

جب ''خاطر'' لمحہ بھر کے لیے آئے تو اسے ''کیفیت'' کہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں محدود وقت کے لیے آنے والی کرن جو جگنو کی روشنی کی طرح آئے اور چلی جائے ''کیفیت'' کہلاتی ہے۔ یہ نورِ باطن اور سرشاری کا جزوقتی ظہور ہوتا ہے۔

جب کیفیت زیادہ دیر کے لیے آنے جانے لگ جائے اور جب آئے تو دیر تک ٹھہرے اور قیام کرے تو اسے ''حال'' کہتے ہیں۔ یعنی بندہ ''کیفیت'' سے نکل کر ''حال'' میں داخل ہو جاتا ہے اور وہ ''کیفیت'' اس کی ''حالت'' بننے لگتی ہے۔

جب کسی بندے کے ''حال'' میں دوام اور استمرار آجائے، اس کی یہ حالت کبھی ختم نہ ہو اور اس کا یہ ''حال'' ہمیشہ قائم رہے، تو اسے ''مقام'' کہتے ہیں۔

نیکی کے ''خاطر'' کی حفاظت کرنے والے کچھ اہلِ کیفیت ہوتے ہیں، کچھ اہلِ حال ہوتے ہیں اور کچھ اہلِ مقام ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ ساری چیزیں خواطر سے

شروع ہوتی ہیں۔ خواطر اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ اس لیے اچھے خواطر کی حفاظت کرنی چاہیے اور بری خاطر کو نہ صرف جھٹکنا اور نکالنا ہے بلکہ اس چیز پر بھی غور کرنا ہے کہ یہ اندھیرا اور برا خیال کیوں اور کہاں سے آیا؟ اس کے سبب اور وجہ کو پکڑنا ہے تاکہ اس کو جڑ سے اُکھاڑا جا سکے۔ اگر غلط خیال آیا ہے تو اس نے دل و دماغ میں کہیں کچھ جگہ پائی ہے، تب ہی تو دوبارہ آیا ہے۔ اب نگہبانی یہ ہے کہ اس بات کا جائزہ لیں کہ وہ کیوں آیا اور اس نے ہمارے دل و دماغ ہی کا انتخاب کیوں کیا ہے؟

۵۔ برے 'خاطر' کے اسباب

دلِ زندہ کے حاملین اولیاء اللہ و صالحین ہمیشہ اس امر پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں کہ برا "خاطر" کیوں آیا؟ میں نے ایسا کیا کام کیا جس سے یہ تاریکی آئی؟ گناہ کا خیال کیوں آیا؟ میرے اندر برے خاطر کو اپنائیت کی کیا شے ملی ہے؟ لہٰذا وہ اس چیز کی تلاش میں سارے دن کا جائزہ لیتے ہیں کہ صبح جب میں اٹھا تھا تو میں نے کیا کیا اَعمال کیے تھے؟ کس کس سے گفتگو کی تھی؟ اس لیے کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم نے گناہ کا کوئی کام کیا یا بعض اوقات کوئی غفلت کی، کوئی نماز چھوڑی، کسی سے زیادتی کر دی، ظلم کر لیا، ماں باپ یا کسی بڑے بزرگ سے اونچا بول لیا، زیادہ کھا لیا، کوئی جھوٹ بول دیا، کسی کی غیبت کی، دھوکہ بازی، خیانت، بے ایمانی یا مالی خیانت کی، شاید حرام کھایا یا کہیں کسی کی کوئی حق تلفی کی، الغرض اس حوالے سے بہت سارے اسباب ہوتے ہیں جو دِل کی موت کے سفر کا نقطہ آغاز اور خواطر کے آنے کے اسباب بن جاتے ہیں۔ Vigilant، قابل اور اچھا چوکیدار وہ ہوتا ہے جو ہلکی سی آہٹ بھی آئے تو کھڑا ہو کر دائیں بائیں دیکھتا ہے۔ چوکیداری کا مطلب یہ ہے کہ بندہ صبح سے لے کر رات تک ایک ایک چیز کو بغور دیکھے۔

اپنی عبادات کو دیکھے، اپنے معاملات کو دیکھے، آداب کو دیکھے اور اپنا اٹھنا بیٹھنا دیکھے۔ بے کار اور فضول باتوں سے بھی یہ چیز آ جاتی ہے۔ مذاق زیادہ کیا تب بھی برا خاطر آ سکتا ہے۔ کسی کی تکذیب و تذلیل کی تب بھی آ سکتا ہے۔ دل میں کسی کے لیے غیبت، چغلی، کینہ آیا تب بھی آ سکتا ہے۔ زبان سے کچھ نہیں کہا مگر دل میں غرور و تکبر آیا تب بھی برا خاطر آ سکتا ہے۔ الغرض برے خواطر کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں جن سے بچنا اشد ضروری ہے۔ بات کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اپنا جائزہ لیں کہ پورا دن کیا کیا؟ یہ وہ اسباب ہیں جنہوں نے دل میں جگہ (space) بنا دی، اب گناہ کی چنگاری اور شیطان کی شرارت دل میں داخل ہو جاتی ہے۔

وہ لوگ جو اللہ کی طرف جانا چاہتے ہیں اور اپنے قلب کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں، وہ اپنے پورے دن کا جائزہ لیتے ہیں اور ہر وقت اپنا محاسبہ جاری رکھتے ہیں۔

چوکیداری کا مطلب یہ ہے کہ بندہ صبح سے رات تک اپنی عبادات، معاملات، عادات کو دیکھے، اٹھنا بیٹھنا دیکھے حتیٰ کہ کسی کی تضحیک و تذلیل، غیبت، چغلی، عناد، بغض، کینہ، تکبر، غضب اور تمام ایسی چیزوں پر نگاہ رکھے جو سیاہی اور گناہ کا باعث بن سکتی ہیں۔ بات کرنے کا مقصد یہ ہے کہ گناہ کی ہلکی سی چنگاری کو بھی اپنے اندر داخل نہ ہونے دیں اور ہر وقت بیدار رہیں تاکہ دل اور دماغ ہر قسم کی غلاظت سے پاک رہے۔

٦۔ نیکی کے "خاطر" اور "خیال" کو پروان چڑھانا

جب نیکی کے خواطر دل سے گزرتے ہیں تو انہیں بھی نگہبانی اور حفاظت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اطاعت و عبادت، درودِ پاک، تقویٰ و طہارت، خیر خواہی، غریب کی مدد، یتیم کی پرورش، محتاج کو کھانا کھلانا، مہمان کی خاطر داری کرنا، بیوی سخت بولے تو نرمی

سے گزارا کرلینا، شوہر سخت بولے تو خاموشی اختیار کرنا، وَٱلۡكَٰظِمِينَ ٱلۡغَيۡظَ (غصہ پی جانا) وَٱلۡعَافِينَ عَنِ ٱلنَّاس (زیادتی کرنے والے کو معاف کر دینا) کا عملی پیکر بننا۔ غرضیکہ یہ تمام وہ اسباب ہیں جو اُس خاطر کو پروان چڑھاتے ہیں جو نیکی کے خیال سے دل سے گزرے تھے۔

نیکی کے نور کے آنے اور چنگاری بننے کے اسباب یہ بھی ہیں کہ کسی پر احسان کر دیا، کسی پر بھلائی کر دی، کسی کو تعلیم دے دی، کسی کو اچھی نصیحت کر دی، کسی غریب کی دل جوئی کر دی، حتیٰ کہ کسی دکھی دل کو مسکرا کر مل لیا اور اَحوال پوچھ لیے اِن چیزوں سے بھی اس نور کی تابانی آسکتی ہے۔

اسی طرح عبادت کر لی، کم کھایا، روزہ رکھ لیا، کم پانی پیا، کم سوئے، زیادہ بیدار رہے، عبادت کی، ذکر کیا اور تسبیح کی۔ اس طرح کے تمام نیک اعمال نور کی حفاظت، پرورش اور نگہبانی کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

۷۔ حفاظتِ قلوب کا مقصد کیا ہے؟

خواطر کی حفاظت کے لیے نیک اعمال کو بار بار کریں تاکہ دل میں نور اور چمک پیدا ہو مگر یہ ذہن میں نہ رہے کہ یہ سب چمک کے لیے کر رہا ہوں۔ اگر چمک مقصود بن گئی اور اصل (مولا) نگاہ سے ہٹ گیا تو پھر مطلب یہ ہو گا کہ ہم یہ سب روشنی اور چمک کے لیے ہی کر رہے ہیں۔ یہ بڑی باریک چیزیں ہیں، اگر بندے کی سمجھ میں آجائیں تو بڑی آسان ہیں۔ یاد رکھیں کہ نیکی اس لیے نہیں کرتے کہ کرامت ملے، مشاہدہ ملے اور زیارت نصیب ہو۔ بہت سے لوگ خواہش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بڑی محنت اور مشقت کرتے ہیں اور اِسی پر لگے رہتے ہیں لیکن حضور نبی اکرم ﷺ کی زیارت نہیں ہوتی۔

کوئی کہتا ہے کہ فلاں کو ہو جاتی ہے مجھے کیوں نہیں ہوتی؟ کرامت اور اِن چیزوں کے پیچھے پڑنے سے منزل کھو جاتی ہے۔ یہ ساری چیزیں by products ہیں، زیارتیں ہوتی رہیں گی، کرامتیں آتی رہیں گی اور برکتیں ملتی رہیں گی۔ اِن چیزوں کے لیے عمل کو اُس لائن پر استوار نہیں کرتے بلکہ عمل کو صرف اللہ کی رضا کے حصول کے لیے کرتے ہیں۔ اُس کی مرضی، چاہے کچھ دکھادے اور چاہے تو ساری زندگی نیک اعمال، تہجد گذاری اور عبادات کے باوجود بھی زیارت نہ کرائے۔ جس نے عمر بھر ایک زیارت بھی نہیں کی اُس کا درجہ بھی کم نہیں ہوا اور جو ہر ہفتے زیارت کرے اُس کا درجہ بھی بلند نہیں ہوا۔ ہمارے concept الٹ ہو گئے ہیں۔

یاد رکھیں! درجات استقامت، صدق، اخلاص، تابع فرمانی اور وفاداری کے ساتھ متعلق ہوتے ہیں۔ دل کو اُس کا خلوت خانہ بنانے، اُس سے تعلق، محبت اور الفت کا رشتہ قائم کرنے اور اُس سے جڑ جانے سے قرب نصیب ہوتا ہے۔ اُس کی طرف ایسی نگاہ کرنا کہ پھر نظر نہ دائیں جائے اور نہ بائیں تو اس صورت میں درجات بھی بلند ہوتے ہیں اور زیارتیں بھی نصیب ہوتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿مَا زَاغَ ٱلۡبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ﴾(١٥)

اُن کی آنکھ نہ کسی اور طرف مائل ہوئی اور نہ حد سے بڑھی (جس کو تکنا تھا اسی پر جمی رہی)۔

(١٥) النجم، ٥٣/ ١٧.

اللہ کے نیک بندوں کا حال یہ ہے کہ اُن کی نگاہ نہ اِدھر مائل ہوتی ہے اور نہ ہی اُدھر، بس اُسی کو تکتے رہنا ان کی زندگی کا مقصد ہوتا ہے۔ اب اُس مالک اور محبوب کی مرضی کہ خوابوں میں آئے یا نہ آئے۔ وہ برکتیں اور کرامتیں دکھائے یا نہ دکھائے۔ پردہ اُٹھائے یا نہ اُٹھائے۔ اگر پردہ نہ اُٹھے تو اِس کا مطلب یہ کبھی نہیں ہوتا کہ سفر طے نہیں ہو رہا۔

اس تصور کو ایک مثال سے سمجھتے ہیں۔ بعض اوقات ہم سفر کرتے ہوئے گاڑی کی کھڑکیاں بند کر لیتے ہیں اور پردے نیچے گرا لیتے ہیں۔ اب ہمیں دائیں بائیں کچھ نظر نہیں آ رہا ہوتا مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ سفر طے نہیں ہو رہا۔ کچھ نظر نہ آنا اور قصہ ہے اور گاڑی کا چلنا اور۔ ڈرائیور کو ہمارے کھڑکی کھولنے یا بند کرنے سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ وہ تو گاڑی مسلسل چلاتا جا رہا ہے۔

اب مالک کی مرضی ہے کہ کس کی کھڑکی پر اُس نے پردہ ڈالا ہوا ہے۔ عین ممکن ہے اُس نے گرد سے بچانے کے لیے کھڑکی بند کر رکھی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر ہم ارد گرد دیکھنے دکھانے کے چکر میں لگ جائیں تو اصل کو دیکھنے سے دھیان ہٹ جائے۔ بعض اوقات اللہ چاہتا ہے کہ اگر میرے اُن بندوں کو روحانی سفر کے دوران برکات، کرامات، ملائکہ اور نور نظر آ گئے، پردے اٹھ گئے، تو میرا یہ بندہ اُن چیزوں میں الجھ جائے گا اور اُن میں گم ہو جائے گا۔ لہٰذا اللہ نہیں چاہتا کہ میرا بندہ کسی غیر میں گم ہو۔ وہ چاہتا ہے کہ میرا بندہ سیدھا میری ہی طرف آئے۔ جنہیں وہ سیدھا اپنی طرف لانا چاہتا ہے، انہیں کہتا ہے کہ ان کھڑکیوں کو بند کر دو، نہ اِدھر دیکھو، نہ اُدھر، صرف میرے دھیان میں لگے رہو۔ جن کے بارے میں اللہ کو علم ہوتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ اب دائیں بائیں کے منظر اِن پر اثر انداز نہیں ہوں گے، چاہے یہ دیکھیں یا نہ دیکھیں ان کا دھیان

نہیں ہٹے گا، تو ان کے لیے پر دے اٹھا دیتا ہے۔ اب وہ چاہیں تو ساری عمر دیکھتے رہیں کیونکہ ان لوگوں کے لیے یہ مناظر مقصود نہیں ہیں۔ یہ تو گردِ راہ اور ضمنی چیزیں ہیں۔ جو لوگ ان چیزوں میں انہماک کے ساتھ لگ جاتے ہیں اور شامل (involve) ہو جاتے ہیں تو ان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ لہٰذا اس طرف نہیں جانا کہ کچھ روشنی نظر آئے اور نہ ہی اس مقصد کے لیے نیک اعمال کرنے ہیں بلکہ جملہ اعمالِ صالحہ کا مقصود و مطلوب صرف اور صرف اللہ رب العزت کی رضا ہونا چاہیے۔

باب چہارم

قلبی حیات و ممات
اور
اولیاء و صلحاء کے اَقوال

قلبی حیات و ممات کے ابتدائی تصورات اور مراحل کو جاننے کے بعد اب ہم اولیاء اور صلحاء کے اقوال کی روشنی میں اس امر کا جائزہ لیتے ہیں کہ اِن مقربین کے ہاں حیاتِ قلبی کیا اہمیت و افادیت رکھتی تھی اور وہ اس کے حصول کے لیے کس طرح کی کاوشیں اور ریاضت و مجاہدہ کرنے کی تلقین فرمایا کرتے ہیں:

ا۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

کسی ولی اللہ نے سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا ہے:

مَا سَبَقَكُمْ أَبُوْ بَكْرٍ بِكَثْرَةِ صَلَاةٍ وَلَا صِيَامٍ وَلَكِنْ بِشَيءٍ وَقَرَ فِي صَدْرِهِ.(١٦)

ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تم پر اپنے روزوں اور نمازوں کی وجہ سے سبقت حاصل نہیں کی بلکہ ان کی سبقت کی وجہ ان کے دل کا جماؤ ہے۔

امام غزالی اور احمد الرفاعی نے اس قول کو حدیث مبارک کہا ہے۔(١٧)

---

(١٦) ١- ابن رجب الحنبلي، جامع العلوم والحكم، ١/ ٣٠.

٢- السخاوي، المقاصد الحسنة/ ٥٨٤.

٣- المناوي، فيض القدير، ٤/ ١٤٤.

٣- ملا علي القاري، مرقاة المفاتيح، ٩/ ٣٩٣، الرقم/ ٥١٩٨.

یہاں یہ بات سمجھائی جارہی ہے کہ تم دیکھتے ہو کہ ابو بکر کتنا درجہ پا گیا ہے؛ ہمہ وقت محبت رسول ﷺ میں رہتا ہے۔ سن لو! وہ بہت زیادہ نمازیں پڑھنے اور روزے رکھنے کی وجہ سے اِس درجے تک نہیں پہنچا بلکہ وہ اس حال کی وجہ سے یہاں پہنچا ہے جس پر اُس کا دل جما ہوا ہے۔

ایسے حال کا کبھی کبھی مظاہرہ ہوتا ہے۔ اُس میں سے ایک وہ ہے کہ جب ہجرت کے سفر میں غارِ ثور میں داخل ہونے لگے تو حضور ﷺ کو روک لیا کہ آپ اندر نہ آئیں، کیونکہ یہ پرانا غار ہے۔ خدانخواستہ اس میں سانپ ہوں۔ پہلے میں سارے سوراخ بند کرلوں تب آپ اندر تشریف لائیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے کپڑوں سے ایک ایک سوراخ کو بند کر دیا۔ اس طرح سارا کپڑا ختم ہو گیا مگر ایک سوراخ رہ گیا، وہاں آپ نے اپنا انگوٹھا رکھ دیا۔ انہیں یقیناً پتہ تھا کہ یہاں کوئی سانپ ہو گا اگر وہ ڈسنا چاہے تو مجھے ڈس لے، حضور ﷺ کو تکلیف نہ ہو۔ گویا بندے کی اپنی جان بھی پیچھے رہ جاتی ہے اور مقصود محبوب سے محبت کا اظہار ہے جو جان سے بھی محبوب تر ہو جاتا ہے۔ اسی حال اور اس طرح کے ہر مقام پر اظہارِ محبت نے سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اس درجے تک پہنچا دیا۔

اعمال کی قبولیت کا معیار

یاد رکھیں! اللہ تعالیٰ کسی کے تھوڑے عمل کو اِس وجہ سے ضائع نہیں کرتا کہ اُس نے تھوڑا عمل کیا ہے اور نہ کسی کے زیادہ عمل کو اِس وجہ سے قبول کرتا ہے کہ اُس

(١٧) ١- الغزالي، إحياء علوم الدين، ١/ ١٠٠.
٣- أحمد الرفاعي، حالة أهل الحقيقة مع الله/ ١١٧.

نے زیادہ عمل کیا ہے۔ یہ مقدار کی بات نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ تو بندے کے اندر تقویٰ کے نور کو دیکھتا ہے کہ اِس کے اندر کتنا نور ہے۔ میرے لیے کتنی خالصیت ہے اور یہ کتنی یکسوئی کے ساتھ میری طرف متوجہ ہوا ہے؟ اللہ تعالیٰ تو نیت کے معیار کو دیکھتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿لَن يَنَالَ ٱللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلَٰكِن يَنَالُهُ ٱلتَّقْوَىٰ مِنكُمْ﴾(۱۸)

ہر گز نہ (تو) اللہ کو ان (قربانیوں) کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون مگر اسے تمہاری طرف سے تقویٰ پہنچتا ہے۔

ہم قربانی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے ہاں نہ اُس کا گوشت پہنچتا ہے نہ ہی اُس کا خون؛ گوشت تو ہم خود کھا جاتے ہیں اور خون زمین پر بہہ جاتا ہے۔ اللہ کے ہاں دراصل ہمارا تقویٰ ہی پہنچتا ہے۔ یہ دل کا ایک حال ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

﴿لَن تَنَالُواْ ٱلْبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُواْ مِمَّا تُحِبُّونَۚ وَمَا تُنفِقُواْ مِن شَيْءٍ فَإِنَّ ٱللَّهَ بِهِۦ عَلِيمٌ﴾(۱۹)

---

(۱۸) الحج، ۲۲/ ۳۷.
(۱۹) آل عمران، ۳/ ۹۲.

تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکو گے جب تک تم (اللہ کی راہ میں) اپنی محبوب چیزوں میں سے خرچ نہ کرو، اور تم جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو بے شک اللہ اسے خوب جاننے والا ہے۔

مقامِ صدق یہ نہیں ہے کہ بندہ مقام ہی سے جڑا رہے، مقام کی طلب کرے اور مقام، درجے، منزلت اور اپنے status کو دیکھے، بلکہ مقامِ صدق یہ ہے کہ بندہ رب المقام کو دیکھے کہ مقامات پر بٹھانے والا کون ہے؟ مقام کی فکر نہ کرے کہ ملا، یا نہیں ملا، حال ملا یا نہیں ملا۔ اِن چیزوں کو نہ دیکھے بلکہ صرف یہ دیکھے کہ اِن مقامات کے رب سے میرا تعلق کیا ہے؟ میرا رب مجھ سے خوش ہوا ہے کہ نہیں؟ اگر رب خوش ہو گیا تو پھر سارے ہی مقام مل جاتے ہیں۔ بس بندے کی نیت یہ ہو کہ ہم نے ہر حال میں اللہ کو راضی اور خوش رکھنا ہے تاکہ اللہ کی خوشنودی حاصل ہوتی رہے۔

۲۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ

اس حوالے سے معروف صحابی حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:

إِنَّ لِلهِ تَعَالَى عِبَادًا تَطِيْرُ قُلُوْبُهُمْ إِلَى اللهِ اشْتِيَاقًا، لَا يُدْرِكُهَا الْبَرْقُ الْخَاطِفُ(٢٠).

اللہ کے ایسے بندے بھی ہیں جن کے دل اللہ کی طرف اشتیاق و محبت سے اتنی تیزی سے اڑتے ہیں کہ بجلی بھی ان سے پیچھے رہ جاتی ہے۔

(٢٠) الصفوري، نزهة المجالس ومنتخب النفائس، ١/ ٥٤.

بعض بندوں کے دل اللہ کی طرف ایسے اڑتے ہیں جیسے پرندے اور ہوائی جہاز۔ جو اللہ کی طرف شوق کے پر لگا کر اڑتے ہیں، بجلی بھی اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اگر بجلی بھی اُن کے ساتھ چلنا چاہے تو نہیں چل سکتی۔ یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے جب بندے کا اڑنا اُسی کی طرف مائل ہو جائے، ہر چیز اللہ کے لیے لے کر چلنا ہو جائے اور تمام دنیوی اغراض و مقاصد کو اللہ کی طرف کر دینا ہو جائے۔

۳۔ حضرت بایزید بسطامی

حضرت بایزید بسطامی کے پاس ایک شخص آیا اور عرض کرنے لگا کہ مجھے اسمِ اعظم بتا دیں؛ میں نے سنا ہے کہ جس بندے کے پاس اسمِ اعظم ہوتا ہے مشرق سے مغرب تک اُس کا ہی تصرف ہوتا ہے۔ غور طلب بات ہے کہ وہ اسمِ اعظم کیا ہے؟

حضرت بایزید بسطامی نے فرمایا:

لَيْسَ لَهُ حَدٌّ مَحْدُودٌ إِنَّمَا هُوَ فَرَاغُ قَلْبِكَ لِوَحْدَانِيَّتِهِ، فَإِذَا كُنْتَ كَذَلِكَ فَارْفَعْ إِلَيَّ أَيَّ اسْمٍ شِئْتَ فَإِنَّكَ تَصِيرُ بِهِ إِلَى الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ(۲۱).

اسمِ اعظم کی کوئی مخصوص حد نہیں ہے، بے شک اپنے قلب کو اس کی وحدانیت کے لیے ہر شے سے خالی کر دینا ہی اسمِ اعظم ہے۔ جب تم یہ کام کر لوگے تو جس اسم کے ورد سے تم چاہو مشرق و مغرب کی سیر کر سکتے ہو۔

---

(۲۱) أبو نعيم، حلية الأولياء، ۱۰/ ۳۹.

یعنی جب اپنے دل کو اللہ کے لیے خالی کر لیا جائے تو پھر ہر اسم ہی، اسمِ اعظم ہو جاتا ہے۔

۴۔ حضرت ابو سعید الخراز

ابو سعید الخراز فرماتے ہیں:

إِعْلَمْ أَنَّ مُعَامَلَةَ الْقَلْبِ هِيَ تَجْدِيْدُ السِّرِّ مَعَ الْاِنْفِرَادِ بِهِ، وَمُلَاحَظَةَ الْقَلْبِ عَلَى دَوَامِ حِفْظِ الْأَوْقَاتِ مَعَ صِدْقِ الْحَالِ، مِنْ غَيْرِ الْتِفَاتٍ مِنْهُ إِلَى الْوَقْتِ وَالْحَالِ(۲۲).

آگاہ ہو جاؤ! دل کا معاملہ انفرادی طور پر سر کی تجدید ہے، یعنی اس حال کو بہتر کرنا ہے جو اسے میسر ہے۔ اور یہ دل کا ہمہ وقت اس کی حفاظت کرتے ہوئے صدقِ حال کے ساتھ وقت اور حال کی طرف توجہ کیے بغیر اس کیفیت کو ملاحظہ کرتے رہنا ہے (تاکہ تجدید کا یہ عمل جاری رہ سکے)۔

اس سے مراد ہے کہ بندہ دل کے معاملے کو سمجھے اور وہ یہ کہ ہر لمحہ دل کے معاملے کے لیے تجدید (revival) ضروری ہوتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ایک بار حال اچھا ہو گیا؛ کیفیت اچھی مل گئی، تو بس سمجھیں کہ اب وہ اچھا ہو گیا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ اُسے آج اگر اچھی کیفیت مل گئی ہے تو جب تھوڑی سی غفلت ہو گئی، تو یہ کیفیت چلی بھی جائے گی۔ یہ کیفیات آتی اور جاتی رہتی ہیں۔ سب سے زیادہ عارضی چیز کیفیت ہوتی ہے

(۲۲) أحمد الرفاعي، حالة أهل الحقيقة مع الله/ ۱۱۷.

جو آتی جاتی رہتی ہے، مگر جو بر قرار رہے مگر اُس میں کمی و بیشی ہوتی رہے اسے حالت کہتے ہیں۔ حال وہ ہوتا ہے جو جم جائے۔ وہ حال جو کبھی نہ بدلے اسے مقام کہتے ہیں۔ اگر کسی کو کوئی اچھا حال مل جائے تو اِس سے وہ صاحبِ مقام نہیں ہو جاتا۔ اِس کے لیے ضروری ہے کہ ہر وقت اپنی نگرانی اور پاسبانی کرے اور اپنے حال کی تجدید کرتا رہے۔

اسے ہم ایسے بھی سمجھ سکتے ہیں کہ ہم ہر روز غسل کرتے ہیں تاکہ جسم صاف ستھرا رہے، اسی طرح کپڑے بھی تھوڑے سے میلے ہوں تو بدل لیتے ہیں۔ چنانچہ کچھ لوگ ہر روز کپڑے بدلتے ہیں اور کچھ لوگ کچھ دنوں کے بعد، جو ہر روز نہیں بھی بدلتے وہ اس بات کا لازمی خیال رکھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کپڑے میلے نہ ہوں۔ اِسی طرح انسان کے اعمال اور احوال بھی تجدید مانگتے رہتے ہیں۔ اِس کے لیے ضروری ہے کہ بندہ تلاوت کرے، تدبر و تفکر کے ساتھ قرآن میں فکر کرے، استغفار کرے، نماز پڑھے، مراقبہ کرے، درود پاک پڑھے اور یہ تمام چیزیں دل جمعی کے ساتھ کرے۔ دراصل یہ اعمال کی تجدید ہو گی۔ اِسی طرح انسان صبح سے شام تک اپنے اعمال، احوال اور معاملات کی نگہبانی، نگرانی اور پاسبانی کرے۔ جب کہیں تھوڑا سا فرق نظر آئے تو پھر اسے revive کرے، اُس کی fixing کرے تاکہ جس سبب سے کیفیت آئی ہے اور جس سبب سے کوئی بُری چیز داخل ہوئی ہے، اُس کا سدِباب کرکے اسے روکے۔ اگر استقامت کے ساتھ اس طریقہ کار پر عمل پیرا ہو تو پھر قلب کے احوال کی تجدید ہوتی ہے۔

یہ سب کچھ اس وقت ہوتا ہے جب بندہ اپنے تمام اوقات کو ملاحظہ کرتا ہے، صدقِ حال کے ساتھ اُس کی نگرانی اور حفاظت کرتا ہے۔ اسے چاہیے کہ اپنے ہر عمل، فعل، قول اور ہر چاہت میں سمت صرف اللہ کی طرف رکھے اور یہ کام کسی عہدے، شہرت، عزت واحترام اور appreciation کے لیے نہ کرے۔ انسان چاہتا ہے مجھے

اِس کی وجہ سے عزت ملے، کرسی ملے، لوگ میرے لیے کھڑے ہوں، مجھے عزت دیں، میری کاوش کو مانیں، میرے لیے جگہ چھوڑیں، مجھے سراہیں، مجھے recognise کیا جائے، میری services کو مانا جائے؛ یہ جتنی چیزیں ہیں اِن سب کو جمع کر لیں تو یہ ایک روحانی شرک ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ سب کچھ صرف اللہ کے لیے کیا جائے۔ مگر افسوس! بندے نے اللہ کو ہٹا کر اُس کی جگہ خود کو رکھ لیا کہ میری عزت ہو۔ یہ جتنی چیزیں ہیں اِنہیں لاشعوری طور پر بندہ چاہتا بھی ہے اور چاہت بنا کر دل میں رکھتا بھی ہے۔ یاد رکھیں! یہ ساری چیزیں روحانیت کے درجے میں بت پرستی ہیں اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ بندہ اِن سب چیزوں کی نفی کرے۔

جو بندہ مطالبہ کرتا ہے کہ اُس کی عزت ہو تو جان لیں کہ ایسے عزت نہیں حاصل ہوتی۔ واضح رہے کہ عزت ہمیشہ مخلوق سے بے نیاز ہونے سے ملتی ہے۔ جو آدمی طلب سے بے نیاز ہو جائے اسے ہی عزت ملتی ہے۔ جو اِن چیزوں میں پڑا رہے، اُس کی کوئی عزت نہیں کرتا اور اُس سے کوئی محبت نہیں کرتا۔ ان چیزوں سے بے نیاز رہنے والا صرف اللہ کا طلب گار ہوتا ہے تب دنیا بھی اُس کی تعظیم و تکریم کرتی ہے۔

۵۔ حضرت اسحاق بن ابراہیم

حضرت اسحاق بن ابراہیم فرماتے ہیں کہ اے بندے! اگر تو ایک ذرہ برابر بھی اللہ کی طرف جھک جائے تو:

خَيْرٌ لَكَ مِنْ جَمِيْعِ مَا طَلَعَتْ عَلَيْهِ الشَّمْسُ(٢٣).

یہ کائنات کی ہر اس شے سے تیرے لیے بہتر ہے جس پر سورج طلوع ہوتا ہے۔

یعنی تیرے دل کا رخ ذرہ برابر بھی اللہ کی طرف ہو جائے تو یہ دنیا و ما فیہا سے زیادہ افضل ہے۔ اگر ہم دل کا رخ اللہ کی طرف کر لیں تو ہمارے آپس کے ۹۹ فیصد فسادات ختم ہو جائیں۔ ہم اکثر یہی رونا روتے ہیں کہ 'فلاں نے یہ کر دیا ہے' اور 'وہ ہمارے بارے میں یہ کہتے ہیں'۔ ہم تو ہر وقت اِسی میں مگن رہتے ہیں۔ ہم اپنے دل کا رخ اللہ کی طرف نہیں کرتے، اِس لیے باقی چیزیں نظر آتی ہیں۔ اگر ہم رخ اللہ کی طرف کر لیں تو پھر یہ دھندے نظر ہی نہیں آئیں گے اور بندہ اِن سے بے نیاز ہو جائے گا۔

اِسی لیے حضرت اسحاق بن ابراہیم نے فرمایا کہ جو شخص اپنے دل کو نفسانی شہوات کے غبار الغفلات (dust of negligence)، دل کو شہوتوں کی طرف لے جانے والی چیزوں، کدورات، لغویات اور اللہ کی نافرمانی اور معصیات سے پاک کر لے تو ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ اپنے قرب کے راستے کھول دیتا ہے۔ کوئی شخص اگر اِس دل کا حامل ہو جائے تو اسے غایۃ الغایات یعنی قربِ الٰہی میسر آ جاتا ہے۔(٢٤)

(٢٣) أحمد الرفاعي، حالة أهل الحقيقة مع الله/ ١١٧.

(٢٤) أحمد الرفاعي، حالة أهل الحقيقة مع الله/ ١١٧.

٦۔ حضرت بکر بن عبد اللہ

حضرت بکر بن عبد اللہ قرآن مجید کی آیتِ مبارکہ ﴿وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيبٍ﴾[(٢٥)] کی تفسیر میں کہتے ہیں:

وَيَمْشِي بِبَدَنِهِ عَلَى الْأَرْضِ، وَقَلْبُهُ مُعَلَّقٌ بِاللهِ تَعَالَى[(٢٦)].

(جس کا دل قلب منیب بن جائے) وہ شخص زمین پر اپنے جسم کے ساتھ چلتا ہے لیکن اُس کا دل عرشِ الٰہی کے ساتھ متعلق ہوتا ہے۔

یعنی اُس کے لیے یہ چیز کوئی معنی نہیں رکھتی کہ وہ کس کے ساتھ اور کہاں بیٹھا ہے۔ یہ اپنے جسم اور بدن کو دنیا میں مشغول رکھتا ہے اور اُس کا دل اللہ میں مشغول رہتا ہے۔ اگرچہ جسم اور بدن کے عوارض اور دل کے حالات اور معاملات دینِ حق کے احکام کے مطابق چلتے رہتے ہیں۔

۷۔ حضرت ثابت النساج

حضرت ثابت النساج فرماتے ہیں:

قَرَأْتُ الْقُرْآنَ سِنِيْنَ بِالْخَوْفِ فَلَمْ أَجِدِ الْقَلْبَ، ثُمَّ قَرَأْتُهُ بِالرَّجَاءِ فَلَمْ أَجِدِ الْقَلْبَ، ثُمَّ قَرَأْتُهُ بِتَجْرِيْدِ الْقَلْبِ عَنْ كُلِّ

---

(٢٥) ق، ٥٠/ ٣٣.

(٢٦) أحمد الرفاعي، حالة أهل الحقيقة مع الله/ ١١٧.

مَا دُوْنِ اللهِ تَعَالَى، فَعِنْدَ ذٰلِكَ وَجَدْتُهُ. وَرَأَيْتُ عِنْدَ وُجُوْدِهِ الْوِلَايَةَ الْكُبْرَى، وَالْعِزَّةَ الْعُظْمَى، وَالْمَرَاتِبَ الْعُلْيَا(٢٧).

میں نے اللہ کے خوف کو دل میں رکھ کر سالہا سال قرآنِ کریم پڑھ کر (عبادت کی) مگر مجھے حضوری نہ ملی۔ پھر میں نے اللہ کی (رحمت کو دل میں رکھ کر) امید کے ساتھ قرآنِ کریم پڑھا مگر پھر بھی حضوریِ قلب میسر نہ ہوئی۔ پھر میں نے ہر غیر اللہ سے قلب کو صاف کرتے ہوئے تجریدِ قلب کے ساتھ قرآنِ کریم کو پڑھا تو مجھے حضوریِ قلب نصیب ہو گئی۔ (حضوریِ قلب ملنے کے بعد) میں نے ولایتِ کبریٰ، بلند عزت اور اعلیٰ مراتب کا مشاہدہ کیا ہے۔

یعنی سیکڑوں تلاوتیں اور عبادتیں کر کے بھی حضوری نہیں ملی مگر جب دل کو ہر غیر اللہ سے پاک کر کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ جوڑ دیا تو محض ایک سورت پڑھنے سے ہی حضوری نصیب ہو گئی۔

۸۔ حضرت ابو عبد اللہ

حضرت ابو عبد اللہ سے کسی نے پوچھا: قلبِ سلیم کیا ہے؟

اس پر انہوں نے فرمایا:

(٢٧) أحمد الرفاعي، حالة أهل الحقيقة مع الله/ ١١٧.

قَلْبٌ مُنْقَطِعٌ مِنْ عَلَائِقِ الدُّنْيَا، مَمْلُوْءٌ مِنْ حُبِّ الْمَوْلَى، لَا يَشْكُوْ مِنَ الشَّدَائِدِ وَالْبَلْوَى، وَلَا يَهْتِكَ أَسْتَارَ الصِّيَانَةِ وَالتَّقْوَى(٢٨).

جو دل علائقِ دنیا سے کٹ جائے اور مولا کی محبت سے بھر جائے؛ کسی پریشانی، تکلیف اور بلا کے آنے پر شکوہ نہ کرے اور عصمت و پرہیز گاری کے پردوں کو چاک نہ کرے تو اسے قلب سلیم کہتے ہیں۔

سلامتی والے قلب کو قلبِ سلیم کہتے ہیں یعنی وہ دل جو علائقِ دنیا، یعنی دنیا کی چاہتوں، محبتوں، الفتوں، رغبتوں، شہوتوں اور دنیا طلبی سے کٹ جائے اور مولا کی محبت سے سرشار ہو جائے، پھر اُس محبت میں شدت ہو، ایسے میں اگر اُسے کوئی پریشانی، تکلیف اور بلا آئے تو اُس کی زبان اور دل پر کوئی شکوہ نہ آئے اور وہ ہر حال میں اللہ پر راضی رہے تو اُس قلب کو قلبِ سلیم کہتے ہیں۔

۹۔ ایک عارف کا واقعہ

ایک کامل عارف، ولی اللہ مسجد میں بیٹھے تھے کہ ایک شخص کو دیکھا جو اِدھر اُدھر گھوم پھر کر کوئی جگہ تلاش کر رہا تھا۔

انہوں نے پوچھا:

(٢٨) أحمد الرفاعي، حالة أهل الحقيقة مع الله/ ١١٧.

مَا تَطْلُبُ؟

(اے اللہ کے بندے!) تجھے کس چیز کی طلب اور تلاش ہے؟

اس نے جواب دیا: میں کوئی ایسی خالی جگہ تلاش کر رہا ہوں جہاں میں یکسوئی سے نماز ادا کروں اور مجھے کوئی پریشان اور تنگ نہ کرے۔

اس پر انہوں نے فرمایا:

خَلِّ قَلْبَكَ عَمَّا دُوْنِ اللهِ، وَصَلِّ أَيَّ مَوْضِعٍ شِئْتَ(٢٩).

اپنے دل کو اللہ کے سوا ہر شے سے خالی کر لو، پھر جہاں چاہے نماز پڑھو۔

یعنی جب دل ہر غیر اللہ سے بھرا ہوا ہو تو پھر یکسوئی نصیب نہیں ہوتی۔ جب تو اپنے دل کو اِدھر اُدھر، دائیں بائیں اور ہر غیر اللہ سے خالی کر لے گا تو اللہ تعالیٰ تیرے دل میں اتر آئے گا۔ پھر جہاں چاہے نماز پڑھ، تجھے یکسوئی نصیب ہو جائے گی۔

جب دل اللہ کے لیے خالی ہو جائے اور اُس کے ساتھ جڑ جائے تو پھر وہ دل زندہ ہو جاتا ہے۔ اُسے باقی ساری خواہشیں مردہ لگتی ہیں۔ ہم لوگ جس کے لیے لڑتے مرتے ہیں، "یہ نہیں ہوا"، "یہ نہیں ملا"، "میرا یہ ہو گا"، "فلاں کا یہ ہو گا"، یہ جو چوبیس گھنٹے زندگی کے مسائل ہوتے ہیں، یہ ہم سب مُردوں کے گوشت نوچتے ہیں اور حرام کھاتے ہیں۔ لیکن اگر دل اللہ کے ساتھ جڑ جائے، دل کی خلوت میں اللہ جلوہ گر ہو جائے اور

(٢٩) أحمد الرفاعي، حالة أهل الحقيقة مع الله/ ١١٧.

بندے کا دل اللہ کے حضور میں رہنے لگے تو پھر بندے کو ساری خواہشیں جن کے لیے بندہ پہلے جیتا اور مرتا تھا، اب وسب کی سب مردہ نظر آنے لگیں گی۔

جب بندہ اللہ کے حضور رہنے لگ جائے تو اُسے ہر چیز سے نجات مل جائے گی اور اُس کا دل زندہ ہو جائے گا اور اُس کے دل کو حضوریِ قلب نصیب ہو جائے گی۔

باب پنجم

قلوب کی اَقسام
اور
حیاتِ قلبی کے اَثرات

اللہ رب العزت کی بارگاہ سے جڑنے سے قلوب کو ایسی زندگی نصیب ہوتی ہے جو دنیا و آخرت میں انسان کے لیے نفع بخشی اور کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿يَوْمَ لَا يَنفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ﴿٨٨﴾ إِلَّا مَنْ أَتَى ٱللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ﴾(٣٠)

جس دن نہ کوئی مال نفع دے گا اور نہ اولاد ○ مگر وہی شخص (نفع مند ہو گا) جو اللہ کی بارگاہ میں سلامتی والے بے عیب دل کے ساتھ حاضر ہوا ○

یعنی مال و دولتِ دنیا اور اسبابِ حیات پسِ مرگ انسان کو ایک رتی برابر بھی نفع نہیں دیں گے بلکہ یہ مال و دولت تو وارثوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ اُس کے کام وہی آئے گا جو اس نے آگے بھیجا ہو گا، اللہ کے دین پر خرچ کیا ہو گا یا صدقہ و خیرات اور نیکی کے کاموں میں لگایا ہو گا۔ اسی طرح اولاد بھی نفع نہیں دے گی۔ سوائے اس اولاد کے جس کی نیکی پر تعلیم و تربیت کی ہو گی اور صالحیت و تقویٰ کی راہ پر چلایا ہو گا۔ اس لیے کہ اولاد کی نیکیوں کا اجر اِن کے والدین کو ان کی قبور میں بھی ملتا رہے گا اور نیک اولاد والدین کے لیے صدقہ جاریہ بن جائے گی۔

اس حوالے سے حکیم الامت ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

---

(٣٠) الشعراء، ٢٦/ ٨٨-٨٩.

یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں، لا الٰہ الا اللہ

یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُوْنَ سے مراد وہ مال ہے جو اللہ رب العزت کے لیے خرچ نہیں کیا گیا۔ اولاد سے مراد وہ اولاد اور بیٹے ہیں جن کی اللہ کی رضا اور خوشنودی کے مطابق تعلیم و تربیت کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ انہیں دنیا کمانے کے لیے تو تیار کیا مگر آخرت، دین اور اللہ رب العزت کی معرفت کے لیے نہیں کیا۔ قیامت کے روز وہ شخص نفع میں ہو گا جو سلامتی والا اور زندہ دل لے کر جائے گا۔ ایسا دل اس کی مدد کرے گا۔ یہ قلبِ سلیم کیا ہے؟

آیئے! اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

ا۔ قلوب کی پہلی تقسیم

عرفاء نے قلب کی درج ذیل تین اَقسام بیان کی ہیں:

(ا) قَلْبٌ مُعَلَّقٌ بِالدُّنْیَا

پہلی قسم ایسے دلوں کی ہے، جن کی پرواز دنیا اور دنیا کی خواہشوں، شہوتوں کے اردگرد رہتی ہے۔ آدمی خواہش کو پروان چڑھاتا ہے کہ یہ مل جائے، یہ ہو جائے، ایسا گھر ہو جائے، ایسی گاڑی ہو جائے، ایسا کاروبار ہو جائے، ایسا مرتبہ (status) ہو جائے، ایسا روزگار ہو جائے، ایسی شہرت ہو جائے، ایسا جاہ و منصب مل جائے اور ایسی اولاد ہو جائے۔ گویا وہ ساری دنیا کی خواہش اور نفس کی لذتیں اور طرح طرح کی چیزیں طلب

کرتا ہے۔ فرمایا: یہ سب طلب کرنے والا ایسا دل ہے جو اِس دنیا میں پرواز کرتا رہتا ہے۔ اُس دل کی پرواز شہوتوں کے ارد گرد ہوتی ہے۔ یعنی یہ دل یَطِيْرُ فِي الدُّنْيَا حَوْلَ الشَّهَوَاتِ(۳۱) کے مصداق دنیا کے ساتھ معلق ہوتا ہے، دنیا میں غرق رہتا ہے اور دنیا اور اس کی لذات و شہوات ہی کے گرد گھومتا رہتا ہے۔

(۲) قَلْبٌ مُعَلَّقٌ بِالآخِرَةِ

دوسری قسم کا دل وہ ہے جو

يَطِيْرُ فِي الْعُقْبَى حَوْلَ الْكَرَامَاتِ(۳۲).

آخرت اور عقبیٰ کی فضاؤں میں کرامات کے گرد پرواز کرتا ہے۔

اس کی پرواز آخرت کے بلند مقامات کے ارد گرد ہوتی ہے۔ یعنی اُس دل کی پرواز کا رخ جنت کی طرف رہتا ہے اور جنت کی حور و قصور، اس کے اعلیٰ باغات و مقامات اور آخرت کی راحتوں، اس کی فضاؤں میں اعلیٰ مقامات اور اعلیٰ درجات کی طلب میں پرواز کرتا رہتا ہے۔

---

(۳۱) أحمد الرفاعي، حالة أهل الحقيقة مع الله/ ۱۲۰.

(۳۲) أحمد الرفاعي، حالة أهل الحقيقة مع الله/ ۱۲۰.

(۳)قَلْبٌ مُعَلَّقٌ بِالْمَوْلٰی

تیسری قسم اس دل کی ہے جو سدرۃ المنتہٰی کی فضاؤں میں اور فوقَ العرش پرواز کرتا رہتا ہے۔ اس دل کی پرواز کا دائرہ اُنس و مناجات کے گرد ہے۔ یعنی یہ دل یَطِیْرُ فِي سِدْرَةِ الْمُنْتَهَى حَوْلَ الْإِنْسِ وَالْمُنَاجَاتِ(۳۳) کے مصداق دل عرش پر سدرۃ المنتہٰی کے گرد پرواز کرتا ہے اور اس کی پرواز عالمِ ملکوت اور عالمِ جبروت میں قدسیانِ فلک اور اللہ رب العزت کی محبت میں مناجات کی آوازوں کے گرد ہوتی ہے۔

۲۔ قلوب کی دوسری تقسیم

قلوب کی مذکورہ بالا تقسیم کے علاوہ عُرفاء نے روحانی دلوں کی درج ذیل تقسیم بھی بیان کی ہے:

(۱)قلبٌ مُنتظرٌ للعطاءِ

یہ روحانی قلوب ہمیشہ اللہ کی عطاء (blessings) کے منتظر رہتے ہیں۔ یہ اچھے، روحانی اور اعلیٰ درجے کے دلوں کا حال ہے۔ اس کو "قَلْبٌ آدَمِيٌّ" بھی کہتے ہیں۔ یعنی اس میں آدم علیہ السلام کے دل کی مشابہت ہے اور اس کی اتباع میں یہ قلبِ آدمی ہے۔

---

(۳۳) أحمد الرفاعي، حالة أهل الحقيقة مع الله/ ۱۲۰.

(۲)قلبٌ مُنتظرٌ للرضا

ان دلوں کو عطاء سے اتنی دلچسپی نہیں ہوتی بلکہ یہ اللہ کی رضا(pleasure) کے انتظار میں رہتے ہیں کہ مولا راضی کب ہو گا؟ یہ راضی بہ رضا دل ہے۔ یہ دل قلبِ ابراہیمی ہے۔ یعنی اس قلب کا وہی حال ہوتا ہے، جو ابراہیم علیہ السلام کے قلب کا تھا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نمرود کی آگ میں ڈالا گیا تو عین اس وقت اللہ رب العزت نے ایک فرشتے کو ابراہیم علیہ السلام کے پاس بھیجا کہ جا کر پوچھو کہ اے ابراہیم! اب آپ کیا چاہتے ہیں؟ اگر آپ چاہیں تو میں انعام کر دوں؟ فرشتے نے آکر پوچھا کہ اے ابراہیم! اب جب کہ آپ کو آگ میں ڈال دیا گیا ہے، آپ کیا چاہتے ہیں؟ آپ علیہ السلام نے جواب دیا: اگر مجھے تجھ سے سوال کرنا ہے، تو مجھے کچھ حاجت نہیں ہے اور اگر سوال اللہ رب العزت سے کرنا ہے تو:

فَهُوَ أَعْلَمُ بِحَالِي مِنْ مَقَالِكَ(۳۴).

وہ میرے حال کو آپ کی بات سے زیادہ جانتا ہے۔

یعنی مجھے سوال کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، وہ مجھے بہتر جاننے والا ہے۔ یہ مقام منتظر الرضاء دلوں کا ہوتا ہے۔ جو دل طلب اور سوال سے آگے گزر جائے اسے مانگنے والوں سے زیادہ ملتا ہے۔ یہ دل مانگنا ہی چھوڑ دیتا ہے اور راضی بہ رضا رہتا ہے کہ محبوب جس حال میں رکھے اور جس طرح رکھے بس اسی حال میں راضی رہنا ہے۔

---

(۳۴) عطية محمد سالم، التفسير، ٦/ ٣.

(۳)قلبٌ مُنتظرٌ للّقاء

تیسری قسم ان روحانی دلوں کی ہے جو اللہ کی ملاقات کے انتظار میں رہتے ہیں کہ اپنے مولا سے ملاقات کب ہو گی؟ ان دلوں کا تذکرہ حضور نبی اکرم ﷺ نے درج ذیل حدیث میں کیا ہے کہ اللہ رب العزت بھی ایسے دل کا مشتاق رہتا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ حضور نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

مَنْ أَحَبَّ لِقَاءَ اللهِ أَحَبَّ اللهُ لِقَاءَهُ، وَمَنْ كَرِهَ لِقَاءَ اللهِ كَرِهَ اللهُ لِقَاءَهُ(٣٥).

جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کو پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملاقات پسند فرماتا ہے؛ لیکن جو اللہ تعالیٰ سے ملنا ناپسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملنا ناپسند فرماتا ہے۔

یہ دل ہمیشہ اللہ کی ملاقات اور دیدار کا منتظر رہتا ہے۔ اسے کسی اور شے میں لطف اور لذت نہیں ملتی۔ یہ اپنے محبوب کی ملاقات کا منتظر رہتا ہے اور اسی کے لیے تڑپتا

---

(٣٥) ١- بخاري، الصحيح، كتاب الرقاق، باب من أحب لقاء الله أحب الله لقاءه، ٥/ ٢٣٨٧، الرقم/ ٦١٤٣

٢- مسلم، الصحيح، كتاب الذكر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب من أحب لقاء الله أحب الله لقاءه ومن كره لقاء الله كره الله لقاءه، ٤/ ٢٠٦٦-٢٠٦٧، الرقم/ ٢٦٨٤، ٢٦٨٦.

٣- أحمد بن حنبل، المسند، ٦/ ٢٠٧، ٢٣٦، الرقم/ ٢٥٧٦٩، ٢٦٠٣١.

ہے۔ ایسے دل کا اللہ تعالی بھی انتظار کرتا ہے کہ میرے بندے نے میرے پاس کب آنا ہے، میں اس سے ملاقات چاہتا ہوں۔ یہ دل ہمیشہ انتظارِ لقاء میں رہتا ہے اور ملاقات کے لیے تڑپتا ہے۔ یہ قلب، قلبِ محمدی ﷺ ہے۔

قلبِ محمدی والے لوگوں کے حال کے بارے میں شیخ ابو الحسن الشاذلی فرماتے ہیں:

وَالسَّعِيْدُ حَقًّا مَنْ أَغْنَيْتَهُ عَنِ السُّؤَالِ مِنْكَ، وَالشَّقِيُّ حَقًّا مَنْ حَرَمْتَهُ مَعَ كَثْرَةِ السُّؤَالِ لَكَ(٣٦).

یہ ان سعادت والے لوگوں کا مقام ہے، جو تیرے ساتھ اِس طرح جڑ گئے ہیں کہ تیری ملاقات اور تیرے دیدار اور تیرے شوق نے اُنہیں تجھ سے سوال کرنے سے بھی بے نیاز کر دیا ہے۔ شقی اور بدبخت وہ شخص ہے، جو کثرت کے ساتھ سوال کرتا ہے مگر پھر بھی محروم رہتا ہے۔

یعنی وہ سوال کرنا بھی بھول گئے ہیں۔ اُن کے اندر تیرا شوق اِس قدر بھڑک اٹھا ہے اور تیری محبت، تیری ملاقات اور تیرے دیدار کی لذت اِس قدر بڑھ چکی ہے کہ وہ سوال کرنا ہی بھول چکے ہیں۔

(٣٦) أبو الحسن الشاذلي، حزب البحر، المشمولة في الطرق الصوفية في مصر من دكتور عامر النجار/ ١٩٠.

۳۔ حیاتِ قلبی کے اثرات

جب دل اِس مقام پر چلا جائے کہ وہ اللہ کے ساتھ جڑ جائے اور اُس میں اُسے استقامت نصیب ہو جائے تو پھر ایسے دل ہلتے نہیں ہیں۔ آندھیاں آتی ہیں، زندگی میں نشیب و فراز (ups and downs) آتے ہیں، کبھی غربت آجاتی ہے، کبھی روزگار چلے جاتے ہیں، کبھی نقصان ہو جاتا ہے، کبھی جانیں چلی جاتی ہیں، کبھی مخالفتیں آجاتی ہیں، زندگی میں زیر و بم اور طوفان آتے ہیں، پریشانیاں آتی ہیں، ازدواجی زندگی پریشان ہو جاتی ہے، خدا جانے کیا کیا ہوتا ہے مگر ان حالات میں خوش نصیب لوگ وہی ہیں جو اللہ اور اس کی رحمت کے ساتھ جڑ جاتے ہیں۔ مذکورہ اعلیٰ درجے کے قلب میں سے کوئی ایک بھی چن لیں۔ اس کی عطاؤں کا انتظار کرنے والا دل لے لیں، یا اُس کی رضا کا انتظار کرنے والا دل لے لیں یا وہ دل لے لیں جو اس کی لقاء کا انتظار کرے، اگر ان میں سے کسی بھی دل کے حامل ہو کر اللہ کے ساتھ جڑ جائیں، اُس کے دروازے پر جھک جائیں اور باقی ہر شے سے بے نیاز ہو جائیں تو تب ہی اس کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔

ہمیں یہ ذہن میں رکھ لینا چاہیے کہ ہمیں اِس نیت سے ایک دروازے پر کھڑا نہیں ہونا چاہیے کہ ہم پر بیک وقت سارے دروازے کھل جائیں۔ ایسی سوچ سے پھر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ایک دروازے پر بہت سے دروازوں کے کھلنے کی امید یا خواہش میں جم جانا اگر ذہن میں ہو تو پھر دروازے نہیں کھلیں گے۔ جب اِن خواہشوں سے پاک ہو کر کھڑے ہوں گے تو پھر:

تُفْتَحْ لَكَ الْأَبْوَابُ.

تم پر سارے دروازے کھل جائیں گے۔

یعنی اگر آدمی مولا کے دروازے پر کھڑا ہو جائے تو اُس میں یہ توقع نہ کرے کہ بہت سارے دروازے میرے اوپر کھلیں گے۔ اگر یہ نیت ہو گی تب اپنے آپ سارے دروازے کھل جاتے ہیں۔ یہ لوگ قلبِ محمدی ﷺ والے ہوتے ہیں۔

جو نہیں مانگتا، اللہ اُسے بے حساب دیتا ہے

حضور نبی اکرم ﷺ نے حدیثِ قدسی میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَنْ شَغَلَهُ ذِكْرِيْ عَنْ مَسْأَلَتِي أَعْطَيْتُهُ أَفْضَلَ مَا أُعْطِي السَّائِلِيْنَ (۳۷).

جس کو میرے ذکر کی مشغولیت نے سوال کرنے سے روک دیا، میں اسے مانگنے والوں سے زیادہ عطا کرتا ہوں۔

یعنی جس شخص کو میری یاد، میری محبت، میری خوشی کی طلب، میری ملاقات کی خواہش اور میری ذات سے قلبی تعلق نے اس حال تک پہنچا دیا ہو اور اتنا مشغول کر دیا ہو کہ وہ مجھ سے مانگنا بھی بھول جائے، تو میں اسے اتنا دیتا ہوں کہ مانگنے والے بھی پیچھے رہ جاتے ہیں۔

جب دل اللہ رب العزت کے ساتھ مشغول ہو جاتا ہے تو وہ اس مقام پر چلا جاتا ہے کہ اسے یہ فکر ہی نہیں رہتی کہ میں نے کیا مانگنا ہے؟ اور جو مانگا وہ ملا یا نہیں ملا؟ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ہم شکوہ کرتے ہیں کہ دعا مانگتے ہوئے اتنا عرصہ ہو گیا ہے، وظیفہ پڑھتے ہوئے اتنا وقت بِیت چکا ہے، مگر ابھی تک یہ ملا نہیں یا یہ ہوا نہیں۔ ہم ٹائم فریم بھی متعین

---

(۳۷) ابن أبي شيبة، المصنف، ٦/ ٣٤، الرقم/ ٢٩٢٧١، ٢٩٢٧٣.

کر دیتے ہیں۔ یعنی ہم مانگتے بھی ہیں اور اختیار بھی اپنا لاگو کرتے ہیں کہ وہ ہمیں دے اور اتنے عرصے میں دے۔ ہمارا کام کرے اور اتنے عرصے میں کرے۔ یہ وقت ہمارے ذہن، دل اور خواہشوں نے متعین کر رکھا ہے اور جب ہمارے متعین کردہ اوقات کے اندر وہ کام نہیں ہوتا، تو ہمارے اندر شکوہ جنم لیتا ہے۔

سوچنے والی بات ہے کہ بھلا شکوہ کیوں جنم لیتا ہے؟ اس لیے کہ ہم نے وقت متعین کرنے کا اختیار بھی اللہ کو نہیں دیا کہ وہ خود مقرر کر لے۔ یہ تو مذاق ہے کہ اُس سے مانگتے بھی ہیں اور اُسے اختیار بھی نہیں دیتے۔ جس بندے کا تعلق اللہ رب العزت سے قائم ہو جاتا ہے تو اس کی دعا کے آداب یہ ہوتے ہیں کہ وہ اپنا اختیار چھوڑ دیتا ہے اور اللہ کے اختیار پر راضی ہو جاتا ہے۔ یہ روحانی دل ہوتا ہے جو مذکورہ بالا قلوب میں سے یا تو منتظرِ عطا ہوتا ہے یا منتظرِ رضا یا پھر منتظرِ لِقاء ہوتا ہے۔ روحانی قلب کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ یہ نہیں سوچتا کہ کیا ملا ہے اور کیا نہیں ملا؟ جو کچھ اللہ تعال دے دے، وہ اسی کو ہی عطا سمجھتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک مقام پر یہ آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نہ دینے اور منع کا فیصلہ بھی عطا ہوتا ہے۔

چونکہ بندہ اپنے نفس کا اختیار ختم کر دیتا ہے، لہٰذا یہ نہ سوچے کہ میں نے جو مانگا ہے اس کے ملنے میں دیر ہو رہی ہے، بلکہ مانگے بھی تو یہ سوچ کر مانگے کہ نہ ملنے پر میں ترکِ ادب نہ کر بیٹھوں۔ کیوں کہ اگر دل میں شکوہ، بے چینی اور اضطراب آگیا تو گویا توکل ختم ہو گیا اور اللہ کے حضور بے ادبی ہو گئی۔ اس لیے اولیاء و عرفاء کہتے ہیں کہ اے بندے! تونے جو مانگا ہے اگر اس کے ملنے میں دیر ہو جائے تو اس پر پریشان نہ ہو۔ اسے تو اللہ کی مرضی پر چھوڑ دے۔ اگر تیرے اندر، نفس میں کوئی اضطراب آئے تو اس بات پر پریشان ہو کہ ادب اور اللہ کے ساتھ تعلق میں کوئی کمی آگئی ہے۔

یعنی جو تو نے مانگا ہے اگر نہیں ملا تو اس تاخیر میں پریشان مت ہو۔ اگر من میں اضطراب اور پریشانی پیدا ہوئی تو اس کا مطلب ہے کہ تو اللہ کے ادب سے خارج ہو گیا ہے۔ اس کے تعلق میں کمزوری آ گئی ہے اور دل میں کچھ اس کی رضا کے خلاف ہو رہا ہے۔ اگر کوئی روحانی دل اللہ کے ساتھ جڑ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے خود دروازے کھول دیتا ہے، مگر جو دروازے کھلنے کا انتظار کرتا ہے، خواہش کرتا ہے تو اُس پر دروازے نہیں کھلتے۔ کیونکہ اس کی دلچسپی اللہ کے دروازے سے نہیں ہے بلکہ دوسرے دروازوں سے ہے۔

ہمیں دل میں نور پیدا کرنے کی اور ایسے دل کی طرف بڑھنے کی ضرورت ہے، جو منتظر بالعطا ہو، منتظر بالرضاء ہو اور منتظر للقاء ہو۔ ایسا دل مل جائے تو یہ زندہ قلب ہے۔ مردہ دل وہ تھا جو دنیا کی خواہشوں کے گرد طواف کرتا تھا، دنیوی لذتوں، جاہ و منصب اور دنیوی متاع کے گرد پرواز کرتا تھا۔ جو دل عقبیٰ اور آخرت کی طرف پرواز کرنے لگ گیا وہ زندہ ہو گیا، اور پھر اس سے بھی وراء مولا کی طرف پرواز کرنے لگ گیا، تو زندہ تر ہو گیا۔

۴۔ حیاتِ قلبی کا حصول کیونکر ممکن ہے؟

حیاتِ قلبی کے حصول، قلب کے حال کو بہتر بنانے اور اسے مضبوط و مستحکم کرنے کے لیے ابتداءً درج ذیل تین اَعمال درکار ہیں:

(۱) تلاوتِ قرآن مجید

(۲) ذکرِ الٰہی

(۳) قیام اللیل

(۱) تلاوتِ قرآن مجید

حیاتِ قلبی کے حصول کے لیے سب سے پہلا عمل قرآنِ مجید کی تلاوت ہے۔ یہ تلاوت معنی و مفہوم اور ترجمہ و تدبر کے ساتھ ہو۔ تھوڑی سی تلاوت کریں مگر اس پر غور و فکر کریں اور جب غور کریں تو دل و دماغ ایک ساتھ ہوں۔ محض ثواب کے لیے پڑھنے سے دلوں کو زندگی نہیں ملتی۔ تدبر کے ساتھ جو پڑھیں اسے اپنے دل پر محسوس کریں۔ جنت کے تذکروں میں اس کا مشاہدہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں قرآن جنت کی بات کرے تو ہمارا دل اور دماغ جنت کو دیکھیں۔ دوزخ کے تذکروں میں آہ و بکا اور خوف ہو۔ یعنی قرآن جب دوزخ کی بات کرے تو ہمارے دل و دماغ، دوزخ کو دیکھیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے انعامات کی بات کرے تو وہ انعامات ہمیں نظر آئیں۔ وہ اگر اوامر اور حکم کی بات کرے تو ہمیں اس کا حکم محسوس ہو کہ اللہ ہم سے کیا چاہ رہا ہے کہ ہم کیا کام کریں۔ اگر منع کرے تو محسوس کریں کہ وہ کیا منع کر رہا ہے۔

اس لیے قرآنِ مجید سے جو کچھ بھی پڑھیں اسے اپنے مَن پر محسوس کریں۔ اس کے معانی کو اپنے اوپر وارد کریں، خواہ ایک صفحہ یا ایک رکوع ہی پڑھ سکیں، اس لیے کہ زیادہ مقدار میں تلاوت ثواب تو دیتی ہے مگر قلب کو زندگی مقدار (quantity) سے نہیں معیار (quality) سے ملتی ہے۔ تھوڑا پڑھیں اور پھر آنکھیں بند کر لیں اور اس میں تدبر کریں۔ جو پڑھا ہے، اس پر غور کریں اور اس کو چشمِ تصور اور دل میں دیکھیں۔ اس تصور سے دل میں نور پیدا ہو گا اور اللہ تعالی کی قربت کی خواہش پیدا ہو گی۔

پھر تصور کریں کہ اللہ تعالی کی قربت کیسے ہو گی؟ جو سمجھ میں آتا ہے اسے تصور میں لائیں کہ ایسی قربت نصیب ہو گی۔ جب یہ پڑھیں کہ اللہ راضی ہو گا، تو تصور کریں

کہ وہ رضا کیسی ہو گی؟ وہ خوش ہو گا تو کیا کرے گا؟ یعنی اللہ رب العزت کی خوشی کا جو تصور بھی ذہن میں آئے، اسے محسوس کریں۔ جس طرح ہمارے شیخ، مرشد ہم سے خوش ہوتے ہیں تو ہمارے احساسات (feelings) کیا ہوتے ہیں۔ ماں باپ خوش ہوتے ہیں تو ہمارے احساسات کیا ہوتے ہیں۔ ان احساسات کو اپنے اندر سموئیں۔ جو حصہ پڑھیں اسے اپنے اندر اتاریں اور تدبر و ترتیل سے پڑھیں۔ جب آہستہ پڑھیں تو ساتھ ہلکا ہلکا گنگنائیں اور ترنم کے ساتھ پڑھیں۔ ہر بندے میں من کو راضی کرنے کی ایک سُر ہوتی ہے، اس لیے لوگوں کے سامنے نہیں بلکہ تنہائی میں تھوڑی دیر خوش الحانی کے ساتھ تلاوت کریں۔

قلب کو زندہ کرنے کا یہ طریقہ ہے ورنہ ہماری زندگیاں شبینے اور تراویح میں قرآن پڑھتے اور سنتے گزر گئیں۔ حفظ بھی ہو رہے ہیں، تلاوتیں بھی ہو رہی ہیں اور شبینے بھی ہو رہے ہیں؛ اس سے ثواب تو مل رہا ہے مگر مردہ دل زندہ نہیں ہو رہے۔ مردہ دلوں کو زندگی کی طرف لانے اور دل کے احوال بدلنے کی ضرورت ہے۔ اس کا نسخہ یہ ہے کہ جب قرآن مجید کی تلاوت کریں تو اس میں گم ہو جائیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا پیغام ہے جو اس نے میرے لیے بھیجا ہے۔ جس سے محبت ہوتی ہے اس کے پیغام کو بار بار پڑھا جاتا ہے، سنا جاتا ہے تب بھی سیر ابی نہیں ہوتی۔ اگر اس پیغام کو ایک بار دیکھیں اور پڑھیں تو اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس سے ہمارا دماغ کا رشتہ ہے، دل کا نہیں۔ دل کا رشتہ ہو تو بار بار پڑھنے میں لذت آتی ہے۔ اس لیے بلاناغہ دل و دماغ کو یکجا کر کے تفکر و تدبر کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کریں۔ یہ سب سے اونچے درجے کا علاج ہے۔ تلاوت قرآنِ مجید کے بعد ہر روز کم از کم ایک خطاب سنیں۔ قرآنِ مجید سے شروع کریں اور خطاب تک آئیں۔ اس کی مسلسل مشق کریں۔ دل کسی وظیفے یا تسبیح سے زندہ نہیں ہو گا بلکہ تلاوتِ

کلامِ الٰہی اور اس میں تدبر و تفکر سے زندہ ہو گا اور خطاب کا سننا بھی اسی تدبر و تفکر کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ اسی کیفیت کو علامہ اقبالؔ یوں بیان کرتے ہیں:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن!

(۲) ذکرِ الٰہی

دل کو استحکام اور حال کو مضبوط کرنے والا دوسرا عمل ذکرِ الٰہی ہے۔ جب اللہ رب العزت کا ذکر کریں تو آنکھیں بند کر کے تصور کریں کہ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں اور اس کی مجلس میں بیٹھے ہیں۔ اس لیے دورانِ ذکر ادب کے ساتھ بیٹھیں اور اپنے دل پر ادب کو وارد کریں۔ اس طرح بیٹھیں جیسے اولیاء و صلحاء کی مجالس میں بیٹھتے ہیں، جیسے آقا کریم ﷺ کی بارگاہ میں مواجہ شریف اور جالیوں کے سامنے بیٹھتے ہیں، جیسے کعبہ معظمہ کے سامنے بیٹھتے ہیں کہ جب کعبہ معظمہ کو دیکھتے ہیں تو دل میں ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے، روضۂ اطہر کو دیکھتے ہیں تو ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے جب قرآنِ مجید کی تلاوت یا ذکر کریں یا درود شریف پڑھیں تو ان کو حضوریِ قلب کے ساتھ پڑھیں اور ایسے سمجھیں جیسے اللہ تعالیٰ سماع فرما رہا ہے۔ ہم اس کے حضور حاضر ہیں اور اُس کی مجلس میں ہیں۔ جب ڈوب کر، حضوری کی کیفیت میں ادب کے ساتھ پڑھیں گے تو اس سے قلب زندہ ہوں گے۔

(۳) قیام اللیل

خستہ دلی، عاجزی اور طہارتِ دائمی کے ساتھ رات کے کسی وقت، پچھلی رات یا مغرب کے بعد، جب تھوڑا اندھیرا چھا جائے تو کچھ وقت اللہ رب العزت کے حضور خواہ دو نفل ہی کیوں نہ ہوں، قیام کریں اور یہ تصور کریں کہ میں مالک کے دروازے پر کھڑا ہوں۔ یہ نوافل اول شب میں پڑھیں، نصف شب میں پڑھیں یا آخر شب میں؛ دو پڑھیں یا چار یا جتنا بھی وقت ملے، مگر اس تصور کے ساتھ پڑھیں کہ مالک کے دروازے پر سائل بن کر کھڑا ہوں۔

یہ تین اَعمال ایسے ہیں کہ جن سے دل میں نور پیدا ہو گا۔ ان کے ساتھ طاعات، عبادات، معاملات، اچھے اَخلاق اور وہ ساری چیزیں جن کا اوپر تذکرہ کیا گیا، ان سے مدد لیں۔ نماز اور دیگر عبادات کی پابندی یقینی بنائیں۔

۵۔ زندہ قلب کی حفاظت کے مددگار اَعمال

جب قلب زندہ ہو جائے تو اُس کی حفاظت کے لیے درج ذیل تین اَعمال مددگار ثابت ہوں گے:

(۱) قلتِ طعام

زندہ قلب کی حفاظت کے مددگار اعمال میں سے پہلا عمل یہ ہے کہ کھانا کبھی پیٹ بھر کر نہ کھائیں۔ زیادہ کھانا ہمارے حاصل کردہ روحانی فیوضات کو ختم کر دیتا ہے۔ اِتنا کھائیں کہ کچھ بھوک رہ جائے، پیٹ کو کچھ خالی رکھیں۔ شکم سیری قلب کو مردہ

کر دیتی ہے۔ اِتنا ضرور کھائیں کہ ہمارے جسم کی ضروریات اور تقاضے پورے ہوں مگر پیٹ بھر کر نہ کھائیں۔

(۲) اَہلِ غفلت سے پرہیز کرنا

دوسرا اہم عمل جو زندہ دل کی حفاظت میں مدد و معاون ہوتا ہے، وہ اہلِ غفلت سے پرہیز ہے۔ جو لوگ اہلِ غفلت، مکمل دنیا دار اور دنیا پرست ہیں، ان کی صحبت سے اجتناب کریں۔ ایسے لوگ مجلس میں دوسروں کی غیبت، چغلی اور برائی بیان کریں گے۔ یہ غافل لوگ نماز اور اللہ کے ذکر کے تارک ہوتے ہیں۔ انہیں آخرت کی فکر نہیں ہوتی بلکہ دنیا میں مگن رہتے ہیں۔ اِن لوگوں کی صحبت سے اجتناب (avoid) کریں۔ یہ لوگ بلاشبہ انسان ہیں، مسلمان ہیں، اُن سے لین دین، سلام دعا، کاروبار اور دنیاوی ضروریات کے لیے واجب تعلق رکھیں، اس سے منع نہیں ہے۔ مگر ان ضروری تقاضوں سے بڑھ کر اُن کی مجلس میں بیٹھیں گے، اُنہیں اپنا دوست بنا کر گپ شپ لگائیں گے، تو وہ گپ شپ قلب کو مردہ کر دے گی۔ کیونکہ اُن کی باتوں میں اللہ اور آخرت کی فکر ہی نہیں ہے۔ لٰہذا یہ فیصلہ ہم نے خود کرنا ہے کہ وہ کون سے لوگ ہیں، جن کی مجلس میں دین، آخرت، روحانی تربیت اور خیر کی بات ہوتی ہے اور کون سی مجلس اچھی باتوں والی ہے اور کون سی مجلس بُری باتوں والی ہے۔

(i) مجلسِ خیر کی علامات

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کن لوگوں کی مجلس میں جا کر بیٹھیں؟ یاد رکھیں! اہلِ خیر اور مجلسِ خیر کی پہچان قطعاً مشکل نہیں ہے۔ ایسے لوگ جن کی مجلس میں دین کی بات

ہو، آخرت کی بات ہو، روحانی تربیت کی بات ہو اور خیر کی بات ہو تو وہ مجلس، مجلسِ خیر ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ سب سے اچھی مجلس کن لوگوں کی ہے؟

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مَنْ ذَكَّرَكُمُ اللهَ رُؤْيَتُهُ، وَزَادَ فِي عِلْمِكُمْ مَنْطِقُهُ، وَذَكَّرَكُمْ بِالْآخِرَةِ عَمَلُهُ(٣٨).

(ان لوگوں کی مجلس سب سے اچھی ہے) جن کو دیکھنے سے تمہیں اللہ تعالیٰ کی یاد آجائے، جن کا بولنا تمہارے علم میں اضافہ کر دے اور جن کا عمل تمہیں آخرت کی یاد دلا دے۔

یعنی تین اقسام کے لوگوں کی محافل میں بیٹھنا جائز ہے:

۱۔ جن کی زیارت سے اللہ رب العزت کی یاد آجائے۔

۲۔ جن کی باتوں اور کلام سے علم و حکمت میں اضافہ ہو۔

۳۔ جن کے عمل کو دیکھنے سے آخرت کی طرف رغبت پیدا ہو۔

بس یہ معیار ہے کہ کام کاج اور معاملات سب سے رکھو، مگر صحبت اور مجالست فقط ان سے رکھو۔ جس مجلس میں یہ تینوں چیزیں نہ پائی جائیں اس مجلس میں مت بیٹھو۔

---

(٣٨) ١- أبو يعلى، المسند، ٤/ ٣٢٦، الرقم/ ٢٤٣٧.
٢- عبد بن حميد، المسند/ ٢١٣، الرقم/ ٦٣١.

یہ قلب زندہ کرنے کا گُر اور راز ہے۔ اگر احتیاط نہیں کریں گے تو جو تھوڑی بہت روحانی کمائی کی ہو گی اسے غافلوں کی ایک مجلس ہی ضائع کر دے گی۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم ساری زندگی اتنا آگے کی طرف نہیں چلتے جتنا پیچھے ہٹ جاتے ہیں، یا وہیں کے وہیں جامد کھڑے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ہم آپس میں بیٹھتے ہیں، خواہ دو افراد ہی کیوں نہ ہوں؛ غیبت، چغل خوری اور دوسروں کی برائی کے علاوہ ہمارے پاس کوئی کام ہی نہیں ہوتا۔ اس لیے جس مجلس مجالسہ یا مصاحبہ یا کمپنی میں غیبت ہو وہاں نہ بیٹھیں۔ جب ہمیں غیبت کی مجلس میں بیٹھنے کی اجازت نہیں تو کیا ہمیں خود غیبت کرنے کی اجازت ہو گی؟ اس لیے غیبت نہ ہمارے کان میں پڑے اور نہ زبان پر آئے۔ جس کی طبیعت میں چغلی ہو، اس سے جھگڑا کرنے اور فساد کرنے کی ضرورت بھی نہیں، بس اس کی صحبت سے اٹھ کر چلے جائیں۔

اسی طرح لغو اور بے مقصد گفتگو بھی قلوب کو مردہ کرتی ہے۔ جہاں لغو گفتگو ہو، شر کی بات ہو، جس محفل میں لوگوں کی برائیوں کو اجاگر کیا جاتا ہو وہاں مت بیٹھیں، اُن کے ساتھ نشست کرنا دلوں کو مردہ کرتا ہے اور پتہ بھی نہیں چلتا اور ہم اپنے ہی ہاتھوں سے اپنا اخلاقی و روحانی نقصان کرتے چلے جاتے ہیں۔

ایسی مجلس جس میں اللہ اور آخرت کی یاد آئے، علم و حکمت میں اضافہ ہو، نصیحت ملے، ادب، تربیت، حسنِ اَخلاق اور زندگی گزارنے کا اچھا سلیقہ ملے، یا جس کی سنگت سے ہم اچھے مسلمان و مؤمن بنیں، نیکی اور طاعت ملے اور اس مجلس کے متلاشی رہا کریں۔ باقی لوگوں کے ساتھ کاروبار اور معاملاتِ زندگی میں مشغول رہیں لیکن جب کام ختم ہو، اُسی وقت ان کی مجلس بھی ختم کر دیں۔ جب ہمارے پاس فارغ وقت ہو تو یہ فیصلہ ہم نے کرنا ہے کہ ہم نے اس وقت کو دل کی زندگی کے لیے استعمال کرنا ہے یا دل کو

مردہ کرنے کے لیے استعمال کرنا ہے؟ فارغ وقت کے لیے چند اچھے دوست چُن لیں۔ باقی لوگوں سے مسکرا کر، پیار و محبت اور عزت سے ملیں اور کسی سے نفرت نہ کریں مگر انہیں ہم مجلس بھی نہ بنائیں۔ جب کسی کے ساتھ بیٹھیں، کسی سے بات کریں یا سنیں تو اس بات کا تعین کریں کہ اس کی باتیں اور اس کی مجلس حیاتِ قلبی کی محافظ ہوں گی یا دل کو مزید مردہ کریں گی؟ اگر اس بات کا تعین نہ کیا اور ان لوگوں کے ہم مجلس ہو گئے تو جو کچھ حاصل کیا تھا وہ بھی جاتا رہے گا۔

اس کی مثال اسی طرح ہے کہ ہم دن بھر پیسے کما کما کر اپنی جیب میں ڈالتے جائیں مگر جب شام کو جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھیں تو معلوم ہو کہ کسی نے جیب کاٹ لی ہے اور جیب میں کچھ موجود نہیں۔ اسی طرح ہم نیکیاں بھی کرتے ہیں، عبادات بھی کرتے ہیں، مساجد بھی بناتے ہیں، ادارے بھی بناتے ہیں، حج بھی کرتے ہیں مگر یہ ساری جمع پونجی ایک ایسی جیب میں ڈالتے رہتے ہیں جو نیچے سے کٹی ہوئی ہے۔ یاد رکھیں! بری مجلس کٹی ہوئی جیب کی طرح ہوتی ہے جس میں کچھ بھی محفوظ نہیں رہتا۔

(ii) صحبتِ صالح سے حصولِ برکات کی شرائط

صحبتِ صالحہ سے نور اور برکت حاصل کرنے کے لیے اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں دو شرائط بیان کی ہیں۔

اس حوالے سے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ٱهۡدِنَا ٱلصِّرَٰطَ ٱلۡمُسۡتَقِيمَ ۝٦ صِرَٰطَ ٱلَّذِينَ أَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ غَيۡرِ ٱلۡمَغۡضُوبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا ٱلضَّآلِّينَ﴾(۳۹)

ہمیں سیدھا راستہ دکھا، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا، ان لوگوں کا نہیں جن پر غضب کیا گیا ہے اور نہ (ہی) گمراہوں کا۔

اس آیت کریمہ میں سیدھی راہ کے تعین کی دو شرائط بیان کی گئی ہیں:

۱۔ صِرَٰطَ ٱلَّذِينَ أَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ کے الفاظ واضح کر رہے ہیں کہ ان کی مجلس میں بیٹھو جن پر اللہ کا انعام ہوا ہے۔ لہٰذا جن کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا رکھنا ہو، دیکھا کریں کہ کیا ان پر اللہ کا انعام ہے؟ یاد رکھیں! اللہ کا انعام اخروی اور روحانی انعام ہوتا ہے، مال و دولت والا انعام نہیں ہوتا۔ اگر وہ بندہ اللہ کا انعام یافتہ ہے تو اس کے ساتھ بیٹھیں، خواہ تھوڑا انعام یافتہ ہی کیوں نہ ہو۔ یعنی شر کی بات نہ کرتا ہو تب بھی جان لو اس پر تھوڑا سا انعام ضرور ہے۔

۲۔ غَيۡرِ ٱلۡمَغۡضُوبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا ٱلضَّآلِّينَ کے ذریعے یہ پیغام دیا جارہا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ صبح اولیاء کے ساتھ بیٹھو اور شام کو اَشقیاء کے ساتھ۔ اِدھر اللہ والوں کے پاس سے نیکی و تقویٰ سن کر آؤ اور اُدھر غیبت و چغلی سن کر آؤ۔ اس سے سب حساب کتاب برابر ہو جائے گا۔ جو کمایا تھا، وہ خرچ ہو گیا۔ اس لیے فرمایا کہ نیک صحبت سے اگر کچھ لینا ہے تو شرط یہ ہے کہ بری صحبت سے بچو۔ اگر ایک طرف نیک صحبت بھی رکھی اور دوسری طرف بد صحبت بھی رکھی، تو کچھ حاصل نہیں ہو گا۔

---

(۳۹) الفاتحة، ۱/ ٦-۷.

سلف صالحین فرماتے تھے کہ جب دوست چننے لگو تو دیکھو کہ اس کی دوستی قیامت کے دن میرے کام آئے گی یا نہیں؟ جس کی دوستی قیامت کے دن کام نہیں آنی، اسے آج بھی دوست نہ بناؤ۔ اس سے صرف سماجی تعلق رکھو مگر فراغت کی دوستی نہ رکھو۔ یہ دیکھو کہ اس کے ساتھ تعلق رکھنے میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی رضا اور خوشنودی ہے یا نہیں؟

(۳) دنیا پرستی اور حرص و ہوس سے پرہیز

زندہ دل کی حفاظت میں تیسرا مددگار عمل یہ ہے کہ وہ کام جو دنیا پرستی اور اس کے حرص و ہوس کے ہیں، ان سے بچیں۔ معاش کمانا اور مال بنانا منع نہیں ہے مگر وہ مادی کام جو دلوں کو مردہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دور کرتے ہیں، ان سے بچیں۔

مذکورہ تین اَعمال دلوں کو زندہ رکھنے میں معاون ہوں گے اور قلوب میں پیدا ہونے والے نور کی حفاظت کریں گے اور قلوب کے نور اور دلوں کی زندگی کو دوام عطا کریں گے۔

باب ششم

مردہ اور زندہ قلوب کی علامات

زندہ اور مردہ دل ہونے کی کیا نشانی ہے؟ ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ دل مردہ ہو گیا ہے یا نہیں؟ اولیاء و صلحاء نے زندہ اور مردہ دلوں کی پہچان کی کچھ علامات بیان کی ہیں، جن سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دل زندہ ہے یا مردہ؟ ذیل میں زندہ اور مردہ دلوں کی علامات کو الگ الگ بیان کیا جا رہا ہے۔

ا۔ مردہ قلوب کی علامات

اولیاء و صلحاء نے مردہ دلوں کی درج ذیل علامات کا تذکرہ کیا ہے۔ ان علامات میں سے اگر کوئی ایک علامت بھی پائی جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ دل مردہ ہو چکا ہے یا مردہ ہو رہا ہے۔

(۱) احساس کا پیدا نہ ہونا

احساس کا پیدا نہ ہونا عَدَمُ الْحُزْنِ عَلَى مَا فَاتَكَ عَنِ الطَّاعَاتِ[۴۰] کہلاتا ہے۔ یعنی نیکی، نماز، روزہ، تسبیح و تہلیل اور وظائف کے چھوٹ جانے پر غم نہ ہو۔ اگر طاعات کے فوت ہونے پر دُکھ بھی نہ ہو تو جان لیں دل مردہ ہے۔ یعنی نیکی نہ کرنے والے کا دل مردہ نہیں ہوا بلکہ نیکی کا عمل چھوٹ جانے کے بعد اگر دل غمگین بھی نہ ہو تو

---

(٤٠) ابن عجيبة، إيقاظ الهمم في شرح متن الحكم، ١/ ١٤٠.

سمجھ لیں کہ دل مردہ ہو چکا ہے۔ اس لیے کہ دل میں نیکی کے چھوٹ جانے اور ضائع ہو جانے کا احساس تک پیدا نہیں ہوا، گویا دل نے اسے قبول کر لیا۔

(۲) ندامت تک نہ ہونا

یہ علامت تَرْكُ النَّدَمِ عَلَى مَا فَعَلْتَ مِنَ الذَّلَّاتِ[۴۱] کہلاتی ہے۔ یعنی اگر کوئی گناہ کر لیا، جیسے: غیبت، چغلی، معصیت اور نافرمانی کر لی، چاہے وہ آنکھ کا گناہ تھا یا جسم کے کسی بھی عضو کا گناہ، اس کا ارتکاب کرنے کے بعد کسی قسم کی شرمندگی اور ندامت نہیں ہوئی تو اس کا مطلب ہے کہ دل مردہ ہے۔ یعنی گناہ معمول (routine) کی چیز بن گئی ہے، اب اسے یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ اس نے کوئی گناہ کا کام کیا ہے۔ ہم روز مرہ معمولات میں دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو زیادتی کرتے ہیں مگر ماننے کو تیار نہیں ہوتے کہ انہوں نے کوئی زیادتی کی ہے۔ لوگ سمجھا سمجھا کر تھک جاتے ہیں مگر وہ ہیں کہ مانتے ہی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اُن کا دل اس قدر مردہ ہو چکا ہے کہ وہ اپنی کی ہوئی زیادتی کو زیادتی ماننے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتے۔ جب زیادتی کرنے والا نادم ہو جائے اور اس کو پتہ چل جائے کہ اس نے زیادتی کی ہے تو وہ فوراً معافی مانگنے کے لیے چلا جاتا ہے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو زیادتی کرنے کے بعد معافی مانگتے ہیں؟ جو ندامت بھی محسوس نہ کرے اور معافی بھی نہ مانگے تو جان لیں کہ اس کا دل مردہ ہو چکا ہے۔

(٤١) ابن عجيبة، إيقاظ الهمم في شرح متن الحكم، ١/ ١٤٠.

(۳) غافلوں کی محبت و صحبت

مردہ دل کی تیسری علامت صُحْبَتُكَ لِلْغَافِلِيْنَ الْأَمْوَاتِ[۴۲] ہے۔ یعنی جو غافل دل اور مردہ لوگ ہیں اگر ان سے صحبت و محبت ہو تو سمجھیں کہ دل مردہ ہے۔ دل زندہ ہو تو اسے مردہ دل سے رغبت اور محبت نہیں ہوتی۔ مردہ دل ہی مردہ دلوں کی صحبت رکھتا ہے۔ جس طرح زندہ دِلوں کی مجلس ذکر و نعت اور تلاوت ہوتی ہے، اسی طرح مردہ دلوں کی مجلس الغيبة والنميمة (غیبت اور چغلی) ہوتی ہے۔ اگر ایسے لوگوں سے اور ان کی مجلس سے محبت ہے تو یہ مردہ دلی کی علامت ہے۔ جب دل زندہ ہو گا تو وہ مردہ دِل لوگوں کے حقوق بھی ادا کرے گا، اگر وہ حاجت مند ہیں تو ان کی حاجت بھی پوری کرے گا اور اگر وہ بھوکے ہیں تو کھانا بھی کھلائے گا۔ ان کے معاملاتِ زندگی بھی سرانجام دے گا مگر شوق اور رغبت سے ان کے ساتھ مراسم نہیں رکھے گا۔

۲۔ زندہ قلوب کی علامات

دل کی زندگی اور زندہ ہونے کی درج ذیل تین علامات ہیں۔ یہ علامات وہ ہیں جن پر ہر کوئی اپنے دل کے معاملے کو جانچ سکتا ہے کہ اس کا دل زندہ ہے یا مردہ؟

---

(٤٢) ابن عجيبة، إيقاظ الهمم في شرح متن الحكم، ١/ ١٤٠.

(۱) دنیا سے لاتعلقی

زندہ دل کی پہلی علامت اَلزُّهْدُ فِي الدُّنْيَا[۴۳] ہے۔ اگر کوئی انسان دنیا کماتا ہے، کھاتا ہے، استعمال کرتا ہے مگر دل کو دنیا کی رغبت، حرص و ہوس اور شہوت سے پاک رکھتا ہے تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ اگر دنیا کے جاہ و منصب، اقتدار و اختیار اور شہرت کی طلب ہے تو اس کا مطلب ہے کہ دل اللہ کی طرف راغب اور زندہ نہیں ہے۔ اگر دل شہواتِ دنیا سے بے رغبت اور بے نیاز ہو جائے تو یہ دلِ زندہ کی علامت ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ دنیا کو استعمال کریں، دنیا میں رہیں مگر دنیا آپ کے اندر نہ رہے۔ یعنی دل میں دنیا کی خواہشات اور لالچ نہ رہے تو یہ زندہ دل کی علامت ہے۔

(۲) ذکرِ الٰہی کی طرف رغبت اور شوق

اللہ رب العزت کے ذکر کا شوق ہونا بھی دلِ زندہ کی علامت ہے، اسے عربی میں اَلاِشْتِغَالُ بِذِكْرِ اللهِ[۴۴] وَطَاعَتِهِ وَمَحَبَّتِهِ وَرَغْبَتِهِ کہتے ہیں۔ یعنی دل اللہ کے ذکر، طاعت، محبت اور رغبت کے ساتھ مشغول ہو۔ یعنی نماز پڑھیں اور دیگر اَعمال صالحہ کریں تو ذوق ملے۔ اگر مجبوری سمجھ کر اور بے رغبتی کے ساتھ اس طرح پڑھیں کہ جیسے کوئی بوجھ اتارتا ہے، تو یہ مردہ دلی کی علامت ہے۔ اگر نماز پڑھنے میں خوشی کا احساس شامل ہو اور اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کریں کہ اللہ کی طاعت میں دل کو راحت مل رہی ہے تو سمجھیں کہ دل کو زندگی مل رہی ہے اور دل زندہ ہے۔ اگر راحت محسوس نہ

---

(۴۳) ابن عجيبة، إيقاظ الهمم في شرح متن الحكم، ١/ ١٤٠.

(۴۴) ابن عجيبة، إيقاظ الهمم في شرح متن الحكم، ١/ ١٤٠.

ہو بلکہ مشقت محسوس ہو تو سمجھ لیں کہ دل مریض ہے اور اگر کراہت محسوس کرے تو سمجھ لیں کہ دل مردہ ہو چکا ہے۔

(۳) صالحین کی محبت و صحبت

تیسری چیز جو دل کو حیات عطا کرتی ہے، وہ صُحْبَةُ أَوْلِيَاءِ اللهِ(۴۵) یعنی اولیاء و صالحین کی صحبت ہے۔ یہ محافظ (protective) بھی ہے اور حیاتِ قلبی کی خالق (creative) بھی۔ اولیاء و صلحاء کی صحبت زندگی پیدا بھی کرتی ہے، زندگی کی حفاظت بھی کرتی ہے اور دل کی زندگی کو محفوظ بھی کرتی ہے۔

صحبتِ صالحہ کی صورتیں اور طریقے

گزشتہ اَدوار میں اولیاء و صلحاء کی مجلس و محبت کا حصول مشکل تھا، صرف جسمانی مجالست ہی ممکن تھی۔ لوگ سیکڑوں، ہزاروں میل کا سفر کر کے اولیاء و صالحین کی مجالس میں بیٹھنے کے لیے جاتے تھے۔ جیسے حضرت جنید بغدادی سالہا سال حضرت معروف کرخی، حضرت بایزید بسطامی، حضرت داؤد طائی اور حضرت بشر الحافی کی صحبت میں بیٹھتے رہے۔ پہلے زمانوں میں جب کسی اللہ والے کی خبر ملتی تو لوگ ان کی صحبت میں وقت گزارنے کے لیے چل کر جاتے۔ کیونکہ اتنی زیادہ سہولیات نہیں تھیں مگر موجودہ دور میں صحبت کی کئی شکلیں میسر ہیں۔ آج جسمانی صحبت بھی ہے اور روحانی بھی۔ حسّی صحبت بھی ہے اور معنوی بھی۔ یعنی اگر ہم جسمانی طور پر شیخ کے آمنے سامنے نہیں بیٹھے

---

(٤٥) ابن عجيبة، إيقاظ الهمم في شرح متن الحكم، ١/ ١٤٠.

مگر معنوی طور پر حکماً، معناً، روحاً، ذہناً اور فکراً صحبتِ شیخ میں ہیں۔ اس صحبت میں خطاب بھی شامل ہے اور کتاب بھی شامل ہے۔

لہٰذا مستند تصانیف کا مطالعہ کریں تو یہ بھی آپ کو صاحبانِ تصانیف کی صحبت میں لے جائے گا۔ یاد رکھ لیں کہ سلف صالحین سے لے کر آج تک یہ قاعدہ و کلیہ بھی ہے، تجربہ و مشاہدہ بھی ہے اور زندگی کا نچوڑ بھی کہ ہر کتاب اگر دل جما کر پڑھیں تو وہ صاحبِ کتاب کی صحبت ہے۔ اس کتاب کے ذریعے اس کے مصنف کا فیض ملتا ہے۔ اس لیے جب قرآنِ مجید پڑھیں تو سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بیٹھے ہیں، یہ دل کو نور اور زندگی دے گا۔ حدیث پاک پڑھیں تو سمجھیں کہ صحبتِ رسول اللہ ﷺ میں بیٹھے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی روایات پڑھ رہے ہیں تو سمجھیں گویا آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ذریعے آقا علیہ السلام کا کلام سن رہے ہیں اور آقا علیہ السلام کی مجلس میں بیٹھے ہیں اور حضور نبی اکرم ﷺ کا فرمان سن رہے ہیں۔ اگر ہم ایسے ہوتے چلے جائیں اور یہ تصور پختہ کر لیں تو آقا کریم ﷺ کی مبارک صوت کا یہ معجزہ ہے کہ کوئی جہاں سے بھی بیٹھ کر سنے حضور ﷺ کا کلام سنائی دیتا ہے۔ مگر ہمارے کان بند ہیں، اگر سننے والے کان ہوں تو سنائی دیتا ہے۔ اس کی کئی مثالیں ہمیں ملتی ہیں:

۱۔ ایک دن حضور نبی اکرم ﷺ مسجد نبوی میں منبر پر بیٹھ کر خطاب فرما رہے تھے اور کچھ لوگ کھڑے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بیٹھ جاؤ۔ مدینہ منورہ میں دور کسی صحابی کا گھر تھا وہ اپنے گھر میں فوری طور پر بیٹھ گئے۔ پوچھا گیا کہ بیٹھ کیوں گئے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ بیٹھ جاؤ۔ بعد میں لوگوں نے معلوم کرنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ وہ صحابی عین اسی وقت اپنے گھر میں بیٹھے، جب حضور نبی اکرم ﷺ نے مسجد

نبوی شریف میں کھڑے ہوئے کچھ لوگوں کو کہا تھا کہ بیٹھ جاؤ۔(۴۶) معلوم ہوا کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی آواز تو ہے مگر ہمارے کان ایسے نہیں ہیں جو اس آواز کو سن سکیں۔

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ وہ صحابی حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ تھے۔

۲۔ اسی طرح سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے دورانِ خطبہ مدینہ منورہ میں فرمایا:

يَا سَارِيَةُ الْجَبَلِ (٤٧).

اے ساریہ! پہاڑ کی اوٹ میں ہو جاؤ۔

اس وقت حضرت ساریہ رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ سے سیکڑوں میل دور عراق کی طرف نہاوند میں تھے۔ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آواز وہیں سن لی۔

معلوم ہوا کہ آوازوں میں طاقت ہے مگر افسوس کہ ان آوازوں کو سننے والے کان نہیں ہیں۔

۳۔ اسی طرح ایسی آنکھیں بھی ہوتی ہیں، جو صاحبِ کتاب کی زیارت کر لیتی ہیں۔ اگر کوئی حدیث مبارک پڑھے گا تو صاحبِ کتاب دیکھتے بھی ہیں۔

---

(٤٦) ١- عبد الرزاق، المصنف، ٣/ ٢١١، الرقم/ ٥٣٦٦-٥٣٦٨.
٢- طبراني، المعجم الأوسط، ٩/ ٦٢، الرقم/ ٩١٢٨.

(٤٧) ١- ابن عساكر، تاريخ مدينة دمشق، ٢٠/ ٢٠
٢- ابن الجوزي، المنتظم، ٤/ ٣٢٥
٣- ذهبي، تاريخ الإسلام، ١/ ٣٨٤
٤- ابن حجر عسقلاني، الإصابة في تمييز الصحابة، ٣/ ٦.

حضور نبی اکرم ﷺ کا فرمان مبارک ہے:

فَوَاللهِ، مَا يَخْفَى عَلَيَّ خُشُوعُكُمْ وَلَا رُكُوعُكُمْ، إِنِّي لَأَرَاكُمْ مِنْ وَرَاءِ ظَهْرِي (٤٨).

اللہ تعالیٰ کی قسم! مجھ سے تمہارے (دلوں کا) خشوع و خضوع بھی پوشیدہ نہیں ہے اور نہ ہی تمہارے رکوع (کی ظاہری حالت مجھ سے مخفی ہے)۔ میں تمہیں اپنی پشت کے پیچھے بھی (اسی طرح) دیکھتا ہوں (جیسے اپنے سامنے دیکھتا ہوں)۔

اس میں اشارہ زمانوں کی طرف بھی ہے کہ میں جس طرح اگلے زمانوں کو دیکھتا ہوں، اسی طرح پچھلے زمانوں کو بھی دیکھتا ہوں۔ اس لیے آج بھی ہم حضور نبی اکرم ﷺ کی نگاہ میں ہیں۔ اگر ہم آپ ﷺ کی تعلیمات اور فرامین کے پڑھنے، سننے اور اس پر عمل کے ذریعے اس صحبت کو اختیار کریں۔

۴۔ شیخ اکبر محی الدین ابنِ عربی فرماتے ہیں کہ میں فاس (مراکو) میں ٹھہرا ہوا تھا اور ایک زمانے میں میرا حال یہ ہو گیا تھا کہ جب میں مسجد میں نماز پڑھنے جاتا تو مجھے مسجد کے چاروں اطراف اسی طرح نظر آتے جس طرح میں آگے دیکھتا ہوں۔ یعنی پورا جسم آنکھ بن جاتا اور میں پیچھے نماز پڑھنے والوں کے حالات بھی دیکھا کرتا تھا۔

---

(٤٨) بخاری، الصحيح، كتاب الصلاة، باب عظة الإمام الناس فی إتمام الصلاة، ١/ ١٦١، الرقم/ ٤٠٨.

کئی لوگ ایسے مقام کے حامل بھی ہوتے ہیں، مگر پھر اللہ تعالیٰ ان کے حالات کو چھپا دیتا ہے، کیونکہ ایسا کرنے لگیں تو نظامِ زندگی درہم برہم ہو جائے۔

ان واقعات کو درج کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ جب ہم کتاب پڑھتے ہیں یا خطاب سنتے ہیں تو اس کے اندر بھی فیوضات کے چشمے بہہ رہے ہوتے ہیں۔ ہمیں اپنے من کی گرہوں کو کھولنا ہے۔ اگر یہ کیفیت اپنا لیں تو ایسی لذت حاصل ہوگی کہ جس کا تصور بھی محال ہے۔ کبھی ہم حضور نبی اکرم ﷺ کی محفل میں بیٹھے ہوں گے اور کبھی امام حسن بصری کی صحبت میں، کبھی جنید و بایزید کی صحبت میں اور کبھی سرکار غوثِ پاک رضی اللہ عنہ کی صحبت میں بیٹھے ہوں گے۔ کشف المحجوب پڑھیں گے تو حضور داتا گنج بخش علی ہجویری کی صحبت میں بیٹھے ہوں گے۔

۳۔ توجہ طلب اُمور

مردہ دلوں کو زندہ کرنے اور زندہ قلوب کی حفاظت کو یقینی بنانے کے لیے ضروری ہے کہ آج ہی سے کچھ وقت نکالیں اور روزانہ کوئی خطاب سنیں۔ یہ مجلس بھی ہے، صحبت و زیارت بھی اور استفادۂ علمی بھی۔ جب یہ عمل کرتے کئی مہینے گزر جائیں گے تو ہم خود محسوس کریں گے کہ صاحبِ کتاب کی صحبت میں بیٹھے ہیں۔ علاوہ ازیں فکری و ذہنی صحبت کے لیے فکر اور ذہن کو ایک طرف لگانا ہے۔ اگر مشن کے ساتھ تعلق درست ہو اور اس میں ذہنی انتشار نہ ہو، تو دوری کے باوجود بھی صحبت ملتی ہے۔ یہ صحبت کا اویسی طریقہ ہے۔ حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے حضور نبی اکرم ﷺ کی زیارت نہیں کی تھی مگر وہ براہِ راست فیض پاتے تھے اور یہ صحبت زمان و مکاں پر حاوی ہو گئی تھی۔

آپس میں جب بھی بیٹھیں تو صحبت کی بنیاد نیکی، للّٰہیت اورآخرت پر استوار کریں۔ گھر میں بھی صحبت اچھی رکھیں اور باہر بھی۔ بعض اوقات باہر اچھی مجالس تلاش کرتے ہیں مگر گھر میں ماحول غیبت اور چغلی کا ہوتا ہے، اس طرح جو کمائی ہوتی ہے وہ ساری ضائع ہو جاتی ہے۔ اس لیے دلوں کو سمندر کی طرح وسیع کر لیں اور اپنے اوپر صحبت و مجالست کا مذکورہ طریقہ نافذ کریں۔ ہر روز اپنا محاسبہ، معائنہ اور مؤاخذہ کریں۔ خرابی حاوی ہونے لگے تو فوراً تصحیح کریں اور توبہ کریں۔ اس سے اللہ رب العزت دلوں میں نور اور زندگی پیدا فرمائے گا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو برکتیں عطا فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ۔

مصادر ومراجع

١ - القرآن الكريم.

٢ - أحمد الرفاعي، (٥١٢-٥٧٨هـ). حالة أهل الحقيقة مع الله. القاهرة، مصر: دار جوامع الكلم، بدون سنة الطبع.

٢ - أحمد الرفاعي، (٥١٢-٥٧٨هـ). حالة أهل الحقيقة مع الله. بيروت، لبنان: دار الكتب العلمية، ١٤٢٥هـ/ ٢٠٠٤م.

٣ - أحمد بن حنبل، أبو عبد الله أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني (١٦٤-٢٤١هـ/ ٧٨٠-٨٥٥م). المسند. بيروت، لبنان: المكتب الإسلامي للطباعة والنشر، ١٤٠٨هـ.

٤ - البخاري، أبو عبد الله محمد بن إسماعيل بن إبراهيم بن مغيرة (١٩٤-٢٥٦هـ/ ٨١٠-٨٧٠م). الصحيح. بيروت، لبنان + دمشق، شام: دار القلم، ١٤٠١ هـ/ ١٩٨١م.

٥ - الصحيح. بيروت، لبنان: دار ابن كثير، اليمامة، ١٤٠٧هـ/ ١٩٨٧م.

٦ - ابن الجوزي، أبو الفرج عبد الرحمن بن علي بن محمد بن علي بن عبيد الله (٥١٠-٥٧٩هـ/ ١١١٦-١٢٠١م). المنتظم في تاريخ الملوك والأمم. بيروت، لبنان: دار صادر، ١٣٥٨هـ.

٧ - الدارمي، أبو محمد عبد الله بن عبد الرحمن (١٨١-٢٥٥هـ/ ٧٩٧-٨٦٩م). السنن. بيروت، لبنان: دار الكتاب العربي، ١٤٠٧هـ.

٨ - الديلمي، أبو شجاع شيروية بن شهردار بن شيروية (٤٤٥-٥٠٩هـ/ ١٠٥٣-١١١٥م). الفردوس بمأثور الخطاب. بيروت، لبنان: دار الكتب العلمية، ١٩٨٦م.

٩ - الذهبي، أبو عبد الله شمس الدين محمد بن أحمد بن عثمان (٦٧٣-٧٤٨هـ/ ١٢٧٤-١٣٤٨م). تاريخ الإسلام. بيروت، لبنان: دار الكتاب العربي، ١٤٠٧هـ/ ١٩٨٧م.

١٠ - ابن رجب الحنبلي، أبو الفرج زين الدين عبد الرحمن بن شهاب الدين البغدادي (٧٣٦-٧٩٥هـ). جامع العلوم والحكم في شرح خمسين حديثا من جوامع الكلم. بيروت، لبنان: دار المعرفة، ١٤٠٨هـ.

١١ - السخاوي، شمس الدين أبو الخير محمد بن عبد الرحمن بن محمد (٨٣١-٩٠٢هـ). المقاصد الحسنة في بيان كثير من الأحاديث المشتهرة على الألسنة. بيروت، لبنان: دار الكتاب العربي، ١٤٠٥ هـ/ ١٩٨٥م.

١٢ - أبو الحسن الشاذلي، حزب البحر، المشمولة في الطرق الصوفية في مصر من دكتور عامر النجار، القاهرة، مصر: دارالمعارف، بدون سنة الطبع.

١٣ - ابن أبي شيبة، أبو بكر عبد الله بن محمد بن أبي شيبة الكوفي (١٥٩-٢٣٥هـ/ ٧٧٦-٨٤٩م). المصنف. رياض، المملكة العربية السعودية: مكتبة الرشد، ١٤٠٩هـ.

١٤ - الصفوري، عبد الرحمن بن عبد السلام الصفوري (م٨٩٤هـ). نزهة المجالس ومنتخب النفائس. مصر: المطبعة الكاستلية، ١٢٨٣ هـ/ ١٩٩٣م.

١٥ - الطبراني، أبو القاسم سليمان بن أحمد بن أيوب بن مطير اللخمي (٢٦٠-٣٦٠هـ/ ٨٧٣-٩٧١م). المعجم الأوسط. موصل، عراق: مطبعة الزهراء الحديثة.

١٦ - الطبراني، أبو القاسم سليمان بن أحمد بن أيوب بن مطير اللخمي (٢٦٠-٣٦٠هـ/ ٨٧٣-٩٧١م). المعجم الكبير. القاهرة، مصر: دار الحرمين، ١٤١٥هـ.

١٧ - عبد بن حميد، أبو محمد عبد بن حميد بن نصر الكسي (ت ٢٤٩هـ/ ٨٦٣م). المسند. القاهرة، مصر: مكتبة السنة، ١٤٠٨هـ/ ١٩٨٨م.

١٨ - عبد الرزاق، أبو بكر بن همام الصنعاني (١٢٦-٢١١هـ). المصنف. بيروت، لبنان: المكتب الإسلامي، ١٤٠٣هـ.

١٩ - ابن عساكر، أبو قاسم علي بن الحسن بن هبة الله بن عبد الله بن حسين الدمشقي الشافعي (٤٩٩-٥٧١هـ/ ١١٠٥-١١٧٦م).

تاريخ مدينة دمشق المعروف بـ: تاريخ ابن عساكر. بيروت، لبنان: دار الفكر، ١٩٩٥م.

٢٠ - عطية محمد سالم، التفسير.

٢١ - ابن حجر العسقلاني، أبو الفضل أحمد بن علي بن محمد بن علي ابن أحمد الكناني الشافعي (٧٧٣-٨٥٢هـ/ ١٣٧٢-١٤٤٩م). الإصابة في تمييز الصحابة. بيروت، لبنان: دار الجيل، ١٤١٢هـ.

٢٢ – ابن عجيبة، أحمد بن محمد الحسني، إيقاظ الهمم في شرح الحكم، القاهرة، مصر: دار المعارف، بدون التاريخ.

٢٣ - الغزالي، أبو حامد محمد بن محمد الغزالي (٤٥٠-٥٠٥هـ). إحياء علوم الدين. مصر، مطبعة عراقية، ١٣٥٢هـ/ ١٩٣٣م. + بيروت، لبنان، دار المعرفة، بدون التاريخ.

٢٤ - اللالكائي، أبو القاسم هبة الله بن الحسن بن منصور اللالكائي (م٤١٨هـ). إعتقاد أهل السنة. الرياض، المملكة العربية السعودية، دار طيبة،١٤٠٢هـ.

٢٥ - ابن ماجه، أبو عبد الله محمد بن يزيد القزويني (٢٠٩–٢٧٣هـ/ ٨٢٤–٨٨٧م). السنن. بيروت، لبنان: دار الكتب العلميه، ١٤١٩هـ/ ١٩٩٨م.

٢٦ - مسلم، أبو الحسين مسلم بن الحجاج بن مسلم بن ورد القشيري النيشابوري (٢٠٦-٢٦١هـ/ ٨٢١-٨٧٥م)، الصحيح، بيروت، لبنان، دار إحياء التراث العربي، بدون تاريخ.

٢٧ - الملّا علي القاري، نور الدين أبو الحسن علي بن سلطان محمد، القارئ الهروي المكي (٩٣٠-١٠١٤هـ). مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح. بيروت، لبنان: دار الكتب العلمية، ١٤٢٢هـ/ ٢٠٠١م.

٢٨ - المناوي، محمد عبد الرؤوف بن تاج العارفين ابن علي بن زين العابدين الحدادي القاهري (٩٥٢-١٠٣١هـ/ ١٥٤٥-١٦٢٢م). فيض القدير شرح الجامع الصغير. مصر: المكتبة التجارية الكبرى، ١٣٥٦هـ.

٢٩ - المنذري، أبو محمد عبد العظيم بن عبد القوي بن عبد الله بن سلامة ابن سعد (٥٨١-٦٥٦هـ/ ١١٨٥-١٢٥٨م). الترغيب والترهيب من الحديث الشريف. بيروت، لبنان: دار الكتب العلمية، ١٤١٧هـ.

٣٠ - أبو نعيم، أحمد بن عبد الله بن أحمد بن إسحاق بن موسى بن مهران الأصبهاني (٣٣٦-٤٣٠هـ/ ٩٤٨-١٠٣٨م). حلية الأولياء وطبقات الأصفياء. بيروت، لبنان، دار الكتاب العربي، ١٤٠٠هـ/ ١٩٨٠م.

٣١ - الهيثمي، نور الدين أبو الحسن علي بن أبي بكر بن سليمان (٧٣٥-٨٠٧هـ/ ١٣٣٥-١٤٠٥م). مجمع الزوائد. القاهرة، مصر: دار الريان للتراث، ١٤٠٧هـ/ ١٩٨٧م.

٣٢ - أبو يعلى، أحمد بن علي بن مثنى بن يحيى بن عيسى بن هلال الموصلي التميمي (٢١٠-٣٠٧هـ/ ٨٢٥-٩١٩م). المسند. دمشق، شام: دار المأمون للتراث، ١٤٠٤هـ/ ١٩٨٤م.